مونوگراف

گوپال متّل

پریم گوپال متّل

مونوگراف

گوپال متّل

پریم گوپال متّل

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی-110025

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

پہلی اشاعت : 2019
تعداد : 550
قیمت : -/80روپے
سلسلہ مطبوعات : 2014

Gopal Mittal
By: Prem Gopal Mittal

ISBN :978-93-87510-79-1

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی 110025، فون نمبر: 49539000، فیکس: 49539099
شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک ۔8، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی ۔110066 فون نمبر: 26109746
فیکس: 26108159 ای۔میل: ncpulsaleunit@gmail.com
ای۔میل: urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in
طابع: جے۔ کے آفسیٹ پرنٹرز، جامع مسجد، دہلی ۔110006
اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

ہمارا دور بھی عجیب ہے ایک طرف جہاں اردو زبان کا حلقہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے تو دوسری جانب دوریاں نزدیکیوں میں تبدیل ہوتی جا رہی ہیں۔ جدید تکنیکی انقلاب نے معلومات کے سمندر کو کوزے میں سمیٹ کر ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے ایسے میں اس خوف کا دامنگیر ہونا خلاف واقعہ نہیں کہ ہمارا قدیم و کلاسیکی ادب اس تکنیکی تلاطم کا شکار نہ ہو جائے۔

اپنے نابغہ ادیبوں و شاعروں پر مونوگراف لکھوانے کے اس نئے سلسلے کا آغاز اسی لیے کیا گیا ہے تا کہ ہم نئی نسل کے سامنے کم سے کم صفحات میں معروف ادبا کا سوانحی خاکہ بھی پیش کر سکیں اور ان کی تحریروں کے منتخب نمونے بھی۔

قومی کونسل نے اس سلسلے میں موجودہ اہم اردو قلمکاروں کی خدمات حاصل کی ہیں اور اب وہ وقت آ گیا ہے کہ ہم قارئین کو براہ راست اپنے اس تجربے میں شامل کریں۔ ہماری یہ کوشش ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ اہم ادیبوں پر مونوگراف شائع کر دیں اور یہ بھی کوشش ہے کہ یہ مونوگراف معلومات کا ذخیرہ بھی ہو، اب اس معیار کو ہم کس حد تک حاصل کر سکے اس کا فیصلہ آپ کریں گے لیکن آپ سے یہ گزارش ضرور ہے کہ اپنے قیمتی مشوروں سے ہمیں ضرور نوازیں تا کہ ہم آئندہ ان مشوروں کو نشانِ منزل بنا سکیں۔

شیخ عقیل احمد

ڈائرکٹر

فہرست

ابتدائیہ	vii
1۔ سوانح وشخصیت	1
2۔ گوپال متل بطور صحافی	25
3۔ گوپال متل بحیثیت شاعر	39
4۔ انتخاب نثر و نظم	55
(i) نثر	55
(ii) نظمیں	66
(iii) غزلیں	77
5۔ گوپال متل صاحب کے کچھ معاصرین	85
● کتابیات	116

ابتدائیہ

گوپال متّل ہمہ جہت فنکار تھے۔ وہ شاعر تھے، نثر نگار تھے، مدیر تھے اور ناشر بھی تھے۔ مدیر کی حیثیت سے انھوں نے تقریباً چھبیس سال ماہنامہ 'تحریک' نکالا اور ایک پوری نسل کی رہنمائی کی۔ انگریزی زبان پر ان کی دسترس کا پتہ سینکڑوں کتابوں سے بھی چلتا ہے جن کا ترجمہ انھوں نے بامحاورہ اردو میں کیا۔

ہماری زبان اردو میں مردہ پرستی کی روایت رہی ہے، لیکن متّل صاحب ان معدودے چند خوش نصیب ادیبوں، صحافیوں اور شاعروں میں سے ایک ہیں جن کی زندگی میں ان کی خدمات کا اعتراف کیا جانے لگا تھا۔ اس کی ابتدا نامور جدید شاعر کمار پاشی نے اپنے سہ ماہی جریدے 'سطور' کے خصوصی شمارے سے کی۔ انھوں نے 'سطور' کا ایک شمارہ (1983) متّل صاحب کے لیے مخصوص کیا اور اس وقت کے متعدد ناقدینِ ادب اور شعرا کو متّل صاحب پر لکھنے کے لیے آمادہ کیا، جن میں بسمل سعیدی، دیوندر ستیارتھی، بلراج کومل، رشید حسن خاں، پروفیسر مظفر حنفی، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، آمنہ ابوالحسن، ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر عنوان چشتی، ڈاکٹر حامدی کاشمیری، بانی، حیات اللہ انصاری،

ڈاکٹر انور سدید، شین کاف نظام، آزاد گلاٹی، کرشن موہن، امیر قزلباش، ضیا فتح آبادی، عزیز تمنائی اور پروفیسر نظیر صدیقی جیسی شخصیات شامل تھیں۔ یہ شمارہ سنگِ میل ثابت ہوا اور بعد میں اسے کتابی صورت میں بھی شائع کیا گیا۔

اسی زمانے میں یونیورسٹی سطح پر بھی متّل صاحب پر کام کی شروعات ہوئی اور موصوف کی حیات میں ہی ان پر ایم فل کیا گیا۔ ڈاکٹر عبدالحکیم نے ان پر مقالہ تحریر کر کے ڈگری حاصل کی اور جموں و کشمیر یونیورسٹی میں بھی ان پر کام ہوا۔ ڈاکٹر ضیاء الدین نے 'گوپال متّل: شخص و شاعر' (2005) عنوان سے مقالہ تحریر کیا۔ ان کے علاوہ مختلف رسائل و جرائد میں بھی مضامین آتے رہے لیکن کم کم۔ یہ سلسلہ متّل صاحب کی وفات کے بعد بھی جاری ہے۔ گزشتہ دنوں ڈاکٹر رضیہ بیگم صاحبہ نے چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی میرٹھ سے ڈاکٹر اسلم جمشید پوری کی نگرانی میں متّل صاحب پر مقالہ تحریر کیا، جو کتابی صورت میں 'گوپال متّل: شخصیت اور فن' کے عنوان سے 2012 میں شائع ہوا۔ ڈاکٹر مطیع اللہ خاں نے ڈاکٹر شہپر رسول کی نگرانی میں 432 صفحات پر مشتمل 'تحریک' کا اشاریہ تیار کیا، جو 'اشاریہ ماہنامہ تحریک دہلی' کے عنوان کے تحت 2011 میں شائع ہوا، اور محترمہ بیگم نازنین صاحبہ مالیر کوٹلہ سے متّل صاحب پر پی ایچ ڈی کر رہی ہیں۔ ماہنامہ 'پرواز' لندن نے اپنے ستمبر 2014 کے شمارے میں 'گوشۂ گوپال متّل' شائع کیا۔

متّل صاحب کے چار شعری مجموعے 'دوراہا' (1944)، 'صحرا میں اذان' (1970 اور 1979)، 'شرارِ نغمہ' (1984) اور 'سچے بول' (1988) شائع ہوئے۔ ان کا شعری سرمایہ یہی چار دواوین ہیں جنھیں 'کلیات' کے عنوان سے میں نے یکجا کر کے ان کی پہلی برسی کے موقع پر (1994) میں شائع کیا۔ 'کلیات' میں ان کے مذکورہ بالا دواوین کے ساتھ ان کے کچھ ضرب المثل بن چکے اشعار بھی شامل کیے گئے تھے، جن میں سے کچھ یہ ہیں:

مجھے زندگی کی دعا دینے والے
ہنسی آ رہی ہے تری سادگی پر

ہم بھی اردو پر ناز کرتے ہیں
یہ ہماری زبان ہے پیارے
مفلسی اور عاشقانہ مزاج
دینے والے یہ کیا دیا تو نے
مصرف کے بغیر جل رہا ہوں
میں سونے مکان کا دِیا ہوں
زندگی زندگی ہوتی تھی کبھی
مر نہ جانے کی سزا ہے اب تو

شعری سرمایے کے ساتھ نثر میں مثّل صاحب کے اداریوں کا سلسلہ دراز ہے جو نصف صدی پر محیط ہے۔ یہ اداریے انھوں نے غیر منقسم ہندوستان کے رسائل و جرائد میں لکھنے شروع کیے اور 1980 کے وسط تک، جب 'تحریک' کی اشاعت موقوف ہوئی، متواتر تحریر کیے۔ انھیں یکجا کر دیا جائے تو ہزاروں صفحات پر پھیل جائیں۔ بیشتر یہ اداریے وقتی نوعیت کے ہیں لیکن کچھ میں ادبی موضوعات بھی زیر بحث آئے ہیں۔ کچھ خالص ادبی مضامین بھی ہیں۔ دو باقاعدہ نثری کتب 'ادب میں ترقی پسندی' اور 'لاہور کا جو ذکر کیا' ان کی یادگار ہیں۔ 'لاہور کا جو ذکر کیا' ابتدا میں ماہنامہ 'تحریک' میں 'کچھ آپ بیتی کچھ جگ بیتی' کے عنوان سے قسط وار شائع ہوا۔ 'تحریک' میں پہلی قسط کی اشاعت کے ساتھ اس روداد کو جو مقبولیت حاصل ہوئی اور ہر طبقۂ خیال نے جس طرح اس کی ستائش کی وہ بہت کم تحریروں کو نصیب ہوتی ہے۔ کتاب کے پہلے ایڈیشن پر نہ صرف اردو کے مقتدر اخبارات و رسائل اور مشاہیر ادبا و شعرا نے تفصیلی اور توصیفی تبصرے کیے بلکہ متعدد انگریزی روزناموں نے بھی کھلے دل سے سراہا۔ یہاں یہ وضاحت دلچسپی کا باعث ہوسکتی ہے کہ مثّل صاحب نے یہ روداد فرصت کے لمحات میں اور تواتر کے ساتھ تحریر نہیں کی ہے بلکہ ہر ماہ جب

'تحریک' پریس جانا ہوتا تو پچھلی قسط کا ازسرنو مطالعہ کرتے جاتے اور اگلی قسط قلم برداشتہ لکھواتے جاتے۔ (متّل صاحب نے اپنی تحریریں اپنے ہاتھ سے خود بہت کم لکھی ہیں، عموماً اردو ڈکٹیشن مخمور سعیدی صاحب اور انگریزی ڈکٹیشن راقم لیتا تھا۔ یہ آپ بیتی بھی انھوں نے اسی طرح تیار کی۔ ہر قسط میں لمبے وقفے کے باوجود پوری کتاب میں جو ربط اور تسلسل ہے وہ واقعی کمال ہے۔

اس کتاب کے چار ایڈیشن ہندوستان میں اور تین ایڈیشن پاکستان میں شائع ہوئے۔ اسی کتاب پر سابق وزیراعظم شری مرارجی ڈیسائی کے دستِ مبارک سے غالب ایوارڈ برائے اردو نثر 1977 پیش کیا گیا۔

ان کے علاوہ انھوں نے پچاس سے زائد چھوٹی بڑی کتابوں کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا، جن میں نوبیل انعام یافتہ الیگزینڈر رسولنسٹین کا شہرۂ آفاق ناول 'کینسروارڈ' بھی شامل ہے۔ چھ سو سے زائد صفحات پر محیط یہ ناول ترجمہ کم اور اصل تحریر زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ انھوں نے کئی کتابیں بھی ترتیب دیں جن میں 'شیرازہ' (شاعری کا انتخاب) اور 'آزادی کا ادب' وغیرہ شامل ہیں۔ انگریزی میں ایک کتاب 'The March of a Conspiracy' بھی ان کی یادگار ہے۔

متّل صاحب کی ولادت کی تاریخ میں اختلاف پایا جاتا ہے جو ان کے لااُبالی مزاج کا پیدا کردہ ہے۔ اس سلسلے میں ان کا ذہن کسی اہتمام کا تابع نہ تھا اور جب جیسا یاد آیا وہی لکھ دیا۔ خاندان کے بزرگوں سے بڑی کھوج بین کے بعد جو تاریخ مجھے معتبر تر معلوم ہوئی میں نے وہی نوٹ کر لی۔ لہٰذا یہی تاریخ معتبر مانی جائے۔ یہ تاریخ 7 جون 1906 ہے۔

کسی بھی موضوع پر لکھی گئی کوئی بھی تحریر حرفِ آخر کا درجہ نہیں پاتی اس لیے اس مونوگراف کو بھی حرفِ آخر نہ سمجھا جائے۔ ممکن ہے متّل صاحب کے فن اور شخصیت کے حوالے سے ان میں جو باتیں کہی گئی ہیں ان میں آئندہ اضافہ ہو یا نئے امکانات کی تلاش و جستجو نئے رنگ بھرے یا ان میں پیش کیے گئے کچھ خیالات ردّ بھی کر دیے جائیں، احتساب کا عمل جاری رہے تو تصویر یقیناً نکھرتی جاتی ہے۔

میں نے کتاب کے آخر میں متّل صاحب کی نگارشاتِ نظم ونثر سے ایک مختصر انتخاب بھی

شامل کر دیا ہے کہ ان کے اسلوب کی ہلکی سی نمائندگی بھی ہو جائے۔ مونوگراف میں 'سچّے بول' کے کچھ حصّے بھی شامل ہیں۔ جیسا کہ متّل صاحب نے خود لکھا ہے یہ ان کی ابتدائی شاعری کا نمونہ ہے اور اس لحاظ سے خاصہ اہمیت کا حامل ہے کہ اس سے ان کے شعری اسلوب کے ابتدائی نقوش کا پتہ چلتا ہے۔

پریم گوپال متّل

سوانح و شخصیت

گوپال متّل 7 جون 1906 کو ریاست مالیر کوٹلہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے وطن میں حاصل کرنے کے بعد لاہور سے بی اے کی ڈگری لی۔

گریجویشن کے بعد 1934 میں لدھیانہ سے ایک ادبی رسالہ ماہنامہ 'صبحِ امید' کے نام سے جاری کیا، جس کا پہلا شمارہ ہی آخری شمارہ بنا۔

'صبحِ امید' بند ہونے کے بعد آپ پھر لاہور چلے گئے اور صحافت کا پیشہ اختیار کیا۔ لاہور کے چار روزناموں میں کام کیا — 'ملاپ'، 'نیشنل کانگریس'، 'بھارت ماتا'، 'نوائے وقت'۔ کچھ مدت تک شمس العلما مولانا تاجور نجیب آبادی کے مشہور ادبی جریدے 'شاہکار' کے مدیر بھی رہے۔

تقسیمِ ملک سے پہلے، چند مہینے تک 'ادبِ لطیف' کی بھی ادارت کی۔ آخری وقت تک وہ یہ مانتے رہے کہ ملک تقسیم نہیں ہوگا اور اگر ہوا بھی تو لاہور ہندوستان کے حصّے میں آئے گا۔ یہ دونوں باتیں غلط ثابت ہوئیں اور اس خوش فہمی نے زیادہ دن ساتھ نہیں دیا۔ لاہور سے ہندو بھاگ ہی نہیں رہے تھے، باہر سے مسلمان آ بھی رہے تھے۔ لاہور کا نقشہ یکسر بدل رہا تھا۔ گھر والے لاہور میں رہنے کو پہلے بھی تیار نہیں تھے، اب متّل صاحب کے قدم بھی ڈگمگا گئے، اور جب امرتسر جانے والی لاریوں کا آخری قافلہ روانہ ہوا تو اس میں ہم بھی سوار تھے۔ امرتسر سے دہلی آئے اور

یہیں کے ہوگئے۔ روزنامہ 'تیج' اور 'ملاپ' میں صحافتی ذمہ داریاں نبھاتے رہے اور بالآخر مارچ 1953 میں ماہنامہ 'تحریک' جاری کیا جو 26 سال تک باقاعدگی سے چلا۔

متّل صاحب کی شخصیت اور فن کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے میں صابردت کے جریدے 'فن اور شخصیت' کے 'آپ بیتی نمبر' (مارچ 1980) سے، متّل صاحب کی خودنوشت کا سہارا لیتا ہوں، جس سے ان کی بھرپور نمائندگی ہوتی ہے۔

''میرے مزاج اور ذہن کی تشکیل میں میری ابتدائی زندگی کے ماحول کا بڑا دخل ہے۔ اس ماحول میں جو عوامل کارفرما تھے، ان کی منطقی توضیح میرے لیے ممکن نہیں کیونکہ منطق کو عمل کی کسوٹی ماننے کا ان دنوں رواج تھا ہی نہیں۔ کفر و ایمان میں کوئی واضح خطِ امتیاز موجود نہیں تھا۔

میری ولادت ریاست مالیر کوٹلہ کی ہے۔ یہ غالباً واحد ریاست تھی جس کی بنیاد کسی صاحبِ سیف و سناں نے نہیں بلکہ ایک مجذوب حیدر شیخ نے رکھی تھی۔ شیخ وہ اپنے روحانی مرتبے کی وجہ سے کہلاتے ہیں۔ ویسے نسبتاً وہ پٹھان تھے۔ میرے والد کا کہنا تھا کہ مجذوبیت کی شان حکمراں خاندان میں بدستور برقرار ہے۔ خاندان کے افراد میں سے کسی نہ کسی میں مجذوبیت کی ادا ضرور ہوتی تھی۔ اتنا میرے ذاتی علم میں بھی ہے کہ نواب احمد علی خاں مرحوم کے ایک بھائی تعویذ تقسیم کیا کرتے تھے۔ شیخ حیدر کے بارے میں مشہور ہے کہ ان کی وفات کے بعد ان کا مقبرہ راتوں رات خودبخود تعمیر ہو گیا تھا اور اس میں چونے یا گارے کا مطلق استعمال نہیں ہوا۔ ایسا ہوا کہ نہیں، اس سے بحث نہیں، لیکن ریاست کے ہندو مسلمان سبھی اس پر متفق تھے کہ یہ محض روایت نہیں۔

یہ بھی مشہور تھا کہ حیدر شیخ کے نام پر جو شخص بھی اولادِ نرینہ کے لیے منّت مانتا ہے، خدا اس کی مراد ضرور پوری کرتا ہے۔ منّت پوری ہونے کے بعد شیخ کے مزار پر بکرے کی قربانی دینا ہوتی تھی لیکن منّت ماننے والوں میں بہت سے ہندو بھی ہوتے تھے جن کے لیے قربانی دینا آسان نہیں تھا۔ درمیانی راہ یہ نکالی گئی تھی کہ منّت ماننے والا ہندو بکرے کی گردن میں سرخ دھاگا باندھ کر اسے مقبرے میں چھوڑ دیتا۔

کہا جاتا ہے کہ جب سرہند کے صوبہ دار نے گرو گوبند سنگھ کے بیٹوں کو دیوار میں چنوانے کا

حکم جاری کیا تو ریاست کے اس وقت کے حکمراں نے احتجاج کیا تھا اور 'آہ' کا نعرہ بلند کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ سکھ ریاستوں میں گھرا ہونے کے باوجود ریاست مالیر کوٹلہ کی سرحدوں پر کبھی کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی۔ ریاست کے نوابوں نے اپنی شانِ کج کلاہی کو بھی برقرار رکھا۔ والد سناتے تھے کہ ایک بار ریاست پٹیالہ کا کوئی ہندو اہلکار مہاراجا کے عتاب سے بچنے کے لیے مالیر کوٹلہ بھاگ آیا۔ پٹیالے کی پولیس نے ریاستی حکام کی اجازت سے ریاست کی حدود میں داخل ہو کر اسے گرفتار کر لیا۔ جب اسے گرفتار کر کے لے جایا جا رہا تھا تو اس کی زبان سے نکلا: ''افسوس! مالیر کوٹلہ والوں نے بھی پناہ نہیں دی۔'' یہ لفظ کسی مسلمان لکڑہارے نے سن لیا، وہ کلہاڑی لے کر پٹیالہ پولیس کے مقابلے آ کھڑا ہوا اور اہلکار سے کہا: ''لالہ! بیٹھ جا'' بات نواب صاحب تک پہنچی تو فرمایا کہ: ''مہاراجا پٹیالہ سے کہنا، ہم نے ان کا ایک مفرور رکھا، وہ ہمارے دو مفرور رکھ لیں۔ اتنی سی بات پر میں بھائیوں سے کیا جھگڑا کروں؟'' چنانچہ لالہ جی مالیر کوٹلہ ہی میں رہے اور اپنی باقی ماندہ زندگی وہیں بڑے مزے میں بسر کی۔

حکمراں خاندان کے افراد پگڑی سکھوں کی طرح باندھتے تھے لیکن ان کی باقی عادات پاس پڑوس کے مہاراجاؤں سے کافی مختلف تھیں۔ رعایا کی بہو بیٹیوں کو اپنی بہو بیٹی سمجھتے تھے۔ قدیم دور کے بارے میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا لیکن نواب احمد علی خاں مرحوم نے شادیوں کے معاملے میں بھی شرعی حدود سے تجاوز نہیں کیا۔ ان کے معالج خصوصی میرے کرم فرما تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ نواب صاحب کی شراب نوشی بھی صرف اس حد تک تھی کہ رات کے کھانے کے بعد برانڈی کا ایک پیگ لے لیا کرتے تھے۔

اپنے مذہب کے احترام کے باوصف، حکمراں خاندان میں مذہبی تعصّب بالکل نہیں تھا بلکہ انتہا درجے کے روادار لوگ تھے۔ محل میں صرف عیدیں ہی نہیں، ہولی اور دیوالی کے تہوار بھی منائے جاتے تھے۔ جو رواداری حکمرانوں میں تھی وہی رعایا میں بھی تھی۔ محرم کے دنوں میں ہندوؤں کی سبیلیں، مسلمانوں کی سبیلوں سے کچھ زیادہ ہی ہوتی تھیں۔

فرقہ وارانہ فساد ریاست میں کبھی نہیں ہوا۔ ایک بار کشیدگی ضرور پیدا ہوئی تھی جو باہر سے آنے والے پرچارکوں اور مولویوں کی رقابت کا نتیجہ تھی۔ مولویوں نے مسلمانوں کو اس غلط فہمی

میں مبتلا کر دیا کہ وہ ریاست کے حکمراں ہیں۔نواب صاحب نے بہت سمجھایا کہ بھائی حکمراں تو میں ہوں، باقی لوگ خواہ ہندو ہوں، مسلمان ہوں یا سکھ ہوں، میری رعایا ہیں۔لیکن کچھ مسلمانوں کا گرمایا ہوا خون اعتدال پر نہ آسکا۔آخر نواب صاحب کو سختی کرنا پڑ گئی۔اس پر ایک مولوی صاحب نے مالیر کوٹلہ کو دارالحرب قرار دے کر ہجرت کا فتویٰ صادر کر دیا۔ظاہر ہے جن مسلمانوں نے اس فتوے پر عمل کیا انھیں کافی پریشانیوں کا سامنا ہوا لیکن پھر رفتہ رفتہ سب واپس آ گئے۔

1947 کے ہنگامے میں بھی مالیر کوٹلہ کی زمین انسانی خون سے آلودہ نہیں ہوئی۔جو مسلمان مالیر کوٹلہ کی سرحد میں داخل ہو جاتا تھا، فسادی اس کا تعاقب چھوڑ دیتے تھے۔یہ انتظام نواب صاحب نے ہی کر رکھا تھا کہ ان کی ہندو رعایا کو مہاجرین کے ہاتھوں کوئی گزند نہ پہنچے۔

ریاست کے ہندو مسلمانوں کے مراسم کچھ اس قسم کے تھے کہ بےتعصبی کا لفظ بھی ان کی پوری وضاحت نہیں کرتا۔ایک دوسرے کے عقائد کا احترام وہ اس حد تک کرتے تھے کہ بعض صورتوں میں خود اپنے عقائد کا احترام بھول جاتے تھے۔مثلاً شبِ برات کے موقع پر ہمارے گھر مسلمان احباب حلوہ لے کر آتے تھے۔حلوے کا تھال ہندو حلوائی کے سر پر ہوتا۔آنے والا دوست دروازے کی کنڈی کھٹکھٹاتا، والد صاحب باہر نکلتے تو ان سے مصافحہ کر کے ایک طرف کھڑا ہو جاتا۔ حلوہ گھر میں پہنچانا ہندو حلوائی کا کام تھا۔انھیں کبھی خیال نہیں گزرتا تھا کہ اس طرح وہ ہندوؤں کے چھوت چھات برتنے کے حق کو تسلیم کر رہے ہیں۔اس ماحول میں پلنے بڑھنے والا مذہبی منافرت اور تعصّب کے مرض کا شکار کیونکر ہو سکتا ہے؟ چنانچہ اب لوگ جب میری بےتعصبی کا ذکر اس طرح کرتے ہیں جیسے وہ مجھے کوئی سند عطا کر رہے ہوں، تو مجھے حیرت بھی ہوتی ہے اور ہنسی بھی آتی ہے۔

میری ابتدائی تعلیم مالیر کوٹلہ ہی میں ہوئی۔اپنے اساتذہ میں سب سے زیادہ ممنون میں منشی کریم بخش کا ہوں جنھوں نے مجھے فارسی پڑھائی۔ان کا خیال تھا کہ اگر کوئی لڑکا 'گلستاں' اور 'بوستاں' صحیح ڈھنگ سے پڑھ لے تو سمجھو اسے پوری فارسی آ گئی اور یہ بھی کہ 'گلستاں' اور 'بوستاں' صحیح ڈھنگ سے صرف وہی پڑھا سکتے ہیں۔انھوں نے دو شادیاں کی تھیں۔میں شام کے وقت پڑھنے جاتا کبھی ایک گھر پر کبھی دوسرے گھر پر۔ان کا طریق درس واقعی نرالا تھا۔کبھی ایک شعر کی

وضاحت میں پورا گھنٹہ صرف کر دیتے اور اس دن کا درس اسی شعر پر ختم ہو جاتا، اور کبھی صفحے کے صفحے پڑھا دیتے۔ شعروں کی تشریح وہ کچھ اس انداز سے کرتے تھے کہ اس میں زیرِ درس شعروں کے علاوہ بھی بہت کچھ آ جاتا تھا۔ مثنوی مولانا روم تک۔ ظاہر ہے جس لڑکے کو 'گلستاں'، 'بوستاں' اس ڈھنگ سے پڑھائی جائیں گی وہ وہاں قناعت نہیں کرے گا۔ اس لیے ان کا یہ کہنا غلط نہیں تھا کہ جو لڑکا ان سے یہ دونوں کتابیں پڑھ لے اسے پوری فارسی آ جاتی ہے۔

منشی جی کے عقائد عجیب و غریب تھے۔ گوشت خوری کے وہ سخت خلاف تھے لیکن اسلامی طریقۂ طبخ کو وہ دنیا میں افضل ترین مانتے تھے۔ کہا کرتے تھے کہ جو طریقۂ طبخ گوشت جیسی چیز کو اتنا لذیذ بنا دیتا ہے وہ سبزیوں کو تو اور بھی لذیذ بنا سکتا ہے۔ اپنے سبھی ہندو دوستوں کو وہ اسلامی طریقۂ طبخ سے آگاہی حاصل کرنے کا مشورہ دیتے تھے۔ گوشت کے معاملے میں تو میں ان کی رائے کا قائل نہ ہو سکا لیکن یہ صحیح ہے کہ اگر بعض سبزیاں اسی طریقے سے پکائی جائیں جس طرح گوشت پکایا جاتا ہے تو لذیذ تر ہو جاتی ہیں۔

مذہباً وہ شیعہ تھے، اتنے کٹّر شیعہ کہ ان کی شاعرانہ صلاحیتیں صرف مرثیوں پر ہی نہیں بلکہ سرسیوں (ایک صنفِ سخن جس میں حضرت علیؓ کے سوا باقی خلفا کی قدح کی جاتی ہے اور بہت واشگاف لہجے میں) پر بھی صرف ہوتی تھیں۔ کبھی موج میں ہوتے تو سرسیہ بھی سنانے بیٹھ جاتے۔ ظاہر ہے کہ 'گلستاں' کے باب پنجم کی تشریح وہ جس تفصیل سے کیا کرتے تھے اس کے بعد سرسیہ سنانے میں کوئی حجاب مانع نہیں ہو سکتا تھا۔ ان کے بیٹے کا نام محمد جان تھا جو میرا ہم عمر بھی تھا اور دوست بھی، لیکن عجیب بات ہے کہ جو لطف منشی صاحب کی معیت میں میسر آتا تھا وہ محمد جان کی صحبت میں کبھی میسّر نہیں آیا۔

مالیر کوٹلہ میں سُنّیوں کی اکثریت تھی، اس سے منشی جی اتنے چڑے کہ ایک وقت ایسا آیا جب وہ اسلام ہی سے بیزار ہو گئے اور اپنے لڑکے کا نام محمد جان سے بدل کر گیان چند رکھ دیا۔

نویں جماعت میں میں لاہور چلا گیا۔ وہاں میرے اردو اور فارسی کے معلّم جناب مولراج تھے۔ ششماہی امتحان میں اردو کے پرچے میں میرا مضمون انھیں اتنا پسند آیا کہ اسے دسویں جماعت کے لڑکوں کو جا کر سنایا اور یہ پیش گوئی کی کہ بڑا ہو کر یہ لڑکا ادیب اور شاعر بنے گا۔ لاہور

سے میرا دل کچھ ہی مہینے میں اچاٹ ہوگیا اور میں پھر مالیر کوٹلہ پہنچ گیا۔ یہ اسکول کے ہیڈ ماسٹر قریشی صاحب کا کرم تھا کہ انھوں نے مجھے نویں جماعت ہی میں داخلہ دے دیا۔ ورنہ میں ایک سال پیچھے رہ جاتا۔ قریشی صاحب ہمیشہ مجھ پر مہربان رہے۔ لیکن جہاں تک ان کی ضابطہ پسندی کا تعلق تھا، وہ اس میں کسی رعایت کے قائل نہیں تھے۔ یاد پڑتا ہے کہ ایک بار صرف پانچ منٹ دیر سے پہنچنے پر انھوں نے مجھے ساری کلاس کے سامنے بید لگائے تھے۔

مالیر کوٹلہ میں شعر و شاعری کا اچھا خاصا ذوق تھا۔ شیخ بشیر حسین بشیر، جو ریاست کے اعلیٰ اہلکار بھی تھے، اپنی کوٹھی پر مہینے میں دو بار طرحی مشاعرے کا اہتمام کرتے تھے اور ان کے شاگردوں کی اچھی خاصی فوج موجود تھی۔ شیخ بشیر داغ کے انداز میں شعر کہتے تھے۔ دہلی ان کا آبائی وطن تھا اور ان کا خیال تھا کہ اگر وہ اچھی ملازمت کی تلاش میں دہلی نہ چھوڑتے تو داغ کو واقعی ایک جانشین مل جاتا۔ دوستوں کے کہنے پر ایک بار ان کے مشاعرے میں میں بھی شریک ہوا، جو غزل پڑھی تھی اس کا ایک شعر آج تک یاد ہے ؎

جو بظاہر کشتگانِ شیوۂ تسلیم ہیں
ایک چنگاری نہاں ان کے بھی آب و گل میں ہے

اس شعر پر مجھے داد تو ملی لیکن اس کے بعد مشاعرے میں شرکت کا دعوت نامہ کبھی نہیں ملا۔ غالباً شعر کے مفہوم میں کوئی خطرناکی تلاش کر لی گئی تھی۔ بہر حال میں نے جلال میرزا خانی سے مل کر، جو تقریباً میرے ہم عمر تھے، ایک متوازی انجمن قائم کر لی اور اس انجمن کے زیرِ اہتمام مالیر کوٹلہ میں پہلی بار غیر سرکاری طور پر کل ہند مشاعرہ ہوا جس میں اختر شیرانی اور اس دور کے متعدد دوسرے نامور شاعروں نے شرکت کی۔

ایف.اے. امتحان پاس کرنے کے بعد مجھے پھر لاہور جانا پڑا کیونکہ مالیر کوٹلہ میں ایف.اے کے بعد تعلیم کا انتظام نہیں تھا۔ لاہور پہنچ کر طبیعت کا لااُبالی پن کچھ زیادہ ہی بڑھ گیا۔ ذوقِ شعری کی وجہ سے شاعروں اور ادیبوں میں گھر جانا تو قدرتی تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ کشتی رانی اور برج کھیلنے کا چسکا بھی پڑ گیا۔ ان تمام باتوں کے باوجود اگر میں بی.اے کے امتحان میں کامیاب ہو گیا تو اسے ایک اتفاقی حادثہ سمجھنا چاہیے۔

بی.اے.کرنے کے بعد فکرِ معاش لاحق ہوئی تو لدھیانہ جا کر 'صبحِ امید' کے نام سے ایک ادبی رسالہ جاری کر دیا۔ ریاست مالیرکوٹلہ کا باشندہ ہونے کی وجہ سے مجھے براہِ راست ڈکلریشن چونکہ نہیں مل سکتا تھا اس لیے ڈیکلریشن ایک مقامی دوست منصور لدھیانوی کے نام پر لیا گیا۔ منصور بہت اچھے غزل گو تھے اور شعر وادب، بالخصوص غزل پر اچھی ناقدانہ نظر رکھتے تھے۔ 'صبحِ امید' کے پہلے شمارے میں انھوں نے حالی کی غزل گوئی پر مضمون لکھا تھا وہ بہت پسند کیا گیا تھا۔ منصور کے علاوہ لدھیانہ میں جن دوستوں کا قرب حاصل ہوا، ان میں نظیر حسین خاں نظیر لدھیانوی، بال مکند عرش ملسیانی اور ایم.حسن لطیفی کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

نظیر لدھیانوی اور عرش ملسیانی نے دفتر اور رہائش کے لیے مجھے اپنے پڑوس ہی میں جگہ لے دی تھی۔ گلی کے ایک کونے میں عرش کا مکان تھا اور دوسرے نکڑ پر نظیر کا۔ نظیر مدیر اعزازی کی حیثیت سے میرے شریکِ ادارت بھی تھے اور واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے میری سرگرم مدد کی۔

'صبحِ امید' شعر وادب سے دلچسپی رکھنے والوں کو پسند آیا۔ لاہور سے اختر شیرانی اور دوسرے دوستوں نے اس کے لیے اپنی چیزیں بھیجی تھیں اور اسد ملتانی نے خیر مقدمی رباعی کہی تھی جو مجھے آج تک یاد ہے ؎

برخیز کہ گردوں بہ مرادت گردید
برخیز کہ رخ نمود صبحِ امّید
تا جوش زندخوں بہ رگ و ریشۂ تو
برخیز و نجور بادہ زجامِ خورشید

سب سے بڑی داد مجھے اس شمارے کی یہ ملی کہ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے اپنے سہ ماہی رسالے 'اردو' میں اس پر تبصرہ کیا۔ تبصرہ مجموعی طور پر ہمارے حق میں تھا البتہ دو ایک مضامین کے طرزِ نگارش کو (جو میری یا نظیر کی تصنیف نہیں تھے) زیادہ شوخ قرار دیا گیا تھا۔ تبصرے میں 'صبحِ امید' کے اغراض ومقاصد پر بحث تھی۔ پرچے کا ایک مقصد ہم نے اردو زبان کا تحفظ قرار دیا تھا۔ بابائے اردو نے اس کا خیر مقدم کیا تھا اور اس پر مسرّت کا اظہار کیا تھا کہ ابھی ایسے ہندو موجود ہیں جو اردو زبان کے تحفّظ وترقی میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ میں اس تبصرے پر بہت خوش تھا، لیکن اپنے ہندو

ہونے کا ذکر مجھے پسند نہیں آیا تھا کیونکہ زندگی ایسی رہی تھی کہ ان خطوط پر کبھی سوچا ہی نہ تھا۔

لدھیانہ میں جن لوگوں سے اس زمانے میں تعلق رہا ان میں ایم حسن لطیفی کی شخصیت انتہائی دلچسپ ہی نہیں بلکہ عجوبہ روزگار تھی۔ موصوف مغرب سے صحافت کی تعلیم حاصل کرکے آئے تھے۔ اچھے شاعر تھے اور علم کی بھی ان کے پاس فراوانی تھی۔ لیکن صحافت کی ڈگری کے ساتھ ساتھ وہ یورپ سے یہ خبط بھی لے کر آئے تھے کہ وہ مہدیِ موعود ہیں۔ وہ تنہا نویسی کے اصول پر ایک پندرہ روزہ پرچہ نکالتے تھے۔ اس میں ان کی نظمیں بھی شائع ہوتی تھیں اور مضامین بھی۔ پرچے میں وہ اپنے مہدیِ موعود ہونے کا پروپیگنڈہ کرتے تھے اور 'نظریۂ مہدویت' کے نام سے انھوں نے ایک کتابچہ بھی لکھا تھا۔ پرچے پر مقامِ اشاعت لدھیانہ کی بجائے 'ارضِ لُد' لکھا کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ بشارتوں کے مطابق مہدیِ موعود ارضِ لُد سے اٹھے گا اور لدھیانہ ہی ارضِ لُد ہے۔ کتابچے سے ان کا مہدیِ موعود ہونا خواہ ثابت نہ ہوتا ہو لیکن ان کے کثیر المطالعہ ہونے کا ثبوت ضرور ملتا تھا۔ انھوں نے ماضی کی بشارتوں کا سہارا لے کر بڑے پُر پیچ استدلال سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ ان کی ذات میں وہ تمام صفات موجود ہیں جو مہدیِ موعود میں پائی جانی چاہئیں۔ اپنے دعویٰ مہدویت کی تائید میں وہ اقبال کا یہ شعر بھی استعمال کیا کرتے تھے ؎

ہوئی جس کی خودی پہلے نمودار
وہی مہدی وہی آخر زمانی

اس سے خیال ہوتا تھا کہ مہدویت ان کے نزدیک وہبی نہیں بلکہ اکتسابی چیز تھی اور ان کے دعوے میں صرف جنون ہی کو دخل نہیں تھا۔ شاید انھوں نے اپنے طور پر ایک چال چلی تھی جو ناکام ہوگئی۔ اسباب خواہ کچھ ہوں نتیجہ عبرت ناک تھا۔ مہدویت کے پرچار میں ان کی دولت بھی ٹھکانے لگتی گئی اور صحت بھی۔ جب میں ان سے ملا تھا تو وہ دھان پان سے رہ گئے تھے۔ سنا ہے کہ تقسیم کے بعد وہ پاکستان چلے گئے تھے۔ پھر ان کا کیا حشر ہوا، خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

'صبحِ امید' کا صرف ایک شمارہ نکلا۔ اس کے بعد میں کچھ دن تک لدھیانہ میں آوارہ گردی کرتا رہا۔ پھر مالیرکوٹلہ میں چندروزہ قیام کے بعد لاہور کا رخ کیا۔ لاہور پہنچ کر ایک گونہ اطمینان ہوا کہ میرے ادیب اور شاعر دوست 'صبحِ امید' کی ناکامی پر میرا مذاق نہیں اڑا رہے تھے۔

انھیں مجھ سے ہمدردی تھی اور وہ یہ بھی محسوس کرتے تھے کہ مجھ میں ادبی کام کرنے کی صلاحیت ہے لیکن اس پر وہ سبھی متفق تھے کہ شعر و ادب کو ذریعۂ معاش بنانا ممکن نہیں۔ ایک اچھا مضمون لکھ کر یا اچھا شعر کہہ کر داد وصول کی جاسکتی تھی، معاوضہ نہیں۔ میرزا عظیم بیگم چغتائی کے چچیرے بھائی فہیم بیگ چغتائی اور احسان دانش میرے اچھے دوست تھے لیکن وہ دونوں خود پریشان حال تھے۔ اختر شیرانی کا معاملہ یہ تھا کہ ع

میں تو خود اپنے بھی کوئی کام آ سکتا نہیں!

صرف حفیظ جالندھری تھے جن سے کچھ توقع کی جاسکتی تھی۔ انھوں نے میری مدد میں کسی بخل سے کام بھی نہیں لیا۔ اس دور کے بہترین ادیبوں سے میرا تعارف کرایا جن میں محمد دین تاثیر، پطرس بخاری، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، عبدالمجید سالک، پنڈت ہری چند اختر بھی شامل تھے۔ یہ لوگ مروّت سے پیش آئے لیکن معاش کا مسئلہ ان دنوں تھا ہی ٹیڑھا۔ آخر روزناموں کے دفتروں کا رخ کیا اور وہاں کام مل بھی گیا لیکن طبیعت لگی نہیں۔ ادبی زندگی کو از سرِ نو شروع کرنے میں احسان دانش میرے معاون ہوئے۔ انھوں نے میرا تعارف مولانا تاجور نجیب آبادی، جنھیں بعد میں شمس العلما کا خطاب ملا، سے کرایا۔ غالبًا تیسری یا چوتھی ملاقات میں مولانا تاجور نے مجھے مشورہ دیا کہ میں ان کے ادبی جریدے 'شاہکار' کی ادارت سنبھالوں۔ یہ پیشکش میرے لیے نعمت سے کم نہیں تھی اور میں نے اسے شکر گزاری کے ساتھ قبول کر لیا۔

'شاہکار' میں میری تنخواہ صرف تیس روپے تھی لیکن دفتر میں میرے لیے باقاعدہ حاضری ضروری نہیں تھی۔ میری ذمہ داری صرف اتنی تھی کہ پرچہ مرتب کر کے اسے بروقت شائع کردوں۔ 'شاہکار' کے بیشتر لکھنے والے ایسے تھے جن کی تحریروں پر نظر ثانی کی ضرورت نہیں تھی۔ خانہ پُری کے لیے ابو محمد امام الدین رام نگری کے مضمون ہر وقت موجود رہتے تھے جو آٹھ آنے فی صفحہ کے حساب سے چھپتے تھے۔ ابو محمد امام الدین کے علاوہ آسی رام نگری کے مضامین بھی انہی شرائط پر چھپتے تھے۔ ان دونوں حضرات کے بھیجے ہوئے بیشتر مضامین ہندی جرائد سے ترجمہ شدہ ہوتے تھے۔ ان کی طرف سے یہ اجازت بھی تھی کہ یہ مضامین کسی بھی نام سے شائع کیے جاسکتے ہیں۔ اگر کسی مہینے مضامین کی قلّت ہوتی تو ان حضرات کے مضامین مختلف ناموں سے شائع کر دیے جاتے۔ یہ نام

زیادہ تو فرضی ہوتے لیکن کئی بار ایسا بھی ہوا کہ مولانا تاجور نے کسی کو نوازنا چاہا تو مضمون اس کے نام پر شائع کر دیا۔ ادارتی نوٹ 'مختصرات' کے عنوان سے مولانا خود لکھتے تھے لیکن مجھے ہدایت تھی کہ اگر بروقت یہ مجھے نہ ملیں تو میں خود ہی لکھ دیا کروں۔

مجھے ملازم رکھتے وقت مولانا نے یہ وعدہ بھی فرمایا تھا کہ تنخواہ کے علاوہ مجھے منافع میں بھی 25 فیصد کا شریک سمجھا جائے گا لیکن جتنی مدّت میں وہاں رہا، مولانا کے بیان کے مطابق پرچے میں خسارہ ہی ہوتا رہا — جہاں تک میرا تعلق ہے میں نے نہ تو ان کے وعدے پر کبھی سنجیدگی سے بھروسہ کیا اور نہ کبھی اس کی یاددہانی ہی کرائی۔

تنخواہ کی کمی کے مسئلے کا حل جلد ہی نکل آیا۔ 'شاہکار' کے دفتر کے قریب ہی ایک مکان پر 'جگت لکشمی' کا سائن بورڈ نظر آیا۔ یہ ایک ہفت روزہ فلمی جریدہ تھا جسے کرن دیوان، جو آگے چل کر فلمی ہیرو بنے، نکال رہے تھے۔ کرن دیوان سے ملاقات ہوئی تو پتہ چلا کہ انھیں کسی ایسے آدمی کی ضرورت ہے جو ان کے اخبار کے لیے اڈیٹوریل وغیرہ لکھ دیا کرے۔ میں نے تیس روپے ماہوار پر یہ ذمّے داری قبول کر لی۔

'جگت لکشمی' باقاعدہ شائع نہیں ہوتا تھا اور کرن دیوان اکثر مالی مشکلات میں مبتلا رہتے تھے۔ مجھے تنخواہ بھی باقاعدگی سے نہیں ملتی تھی اور اوسطاً بیس پچیس روپے ماہوار ہی پڑتے تھے۔ لیکن دفتر کو کرن دیوان خوب سجا کر رکھتے تھے۔ میں اپنا زیادہ وقت وہیں گزارتا اور 'شاہکار' کا کام بھی وہیں بیٹھ کر کرتا تھا۔ ملنے والوں کا بھی، جو اکثر 'شاہکار' کے سلسلے میں آتے تھے، وہیں جمگھٹا رہتا۔

مولانا تاجور کا سلوک میرے ساتھ بہت مشفقانہ تھا۔ انھوں نے 'شاہکار' کے قارئین سے میرا تعارف بہت اچھے لفظوں میں کرایا اور میری نثر اور میری شاعری کی دل کھول کر تعریف کی۔ ایک مرتبہ انھوں نے میرے ایک شعر پر ایک اچھا خاصا مضمون لکھ دیا۔ شعر تھا ؎

مجھے زندگی کی دعا دینے والے
ہنسی آ رہی ہے تری سادگی پر

میرا یہ شعر زبان زدِ خاص و عام ہے اور میرا خیال ہے کہ اس کی مقبولیت میں مولانا کی تحریر کا بڑا دخل ہے۔ ادارتی معاملات میں بھی مولانا تاجور نے مجھے پوری آزادی دے رکھی تھی۔

میرا نام پرچے پر مدیرِ معاون کی حیثیت سے چھپتا تھا لیکن مضمون نگاروں کو خطوط میں اپنے ہی نام سے لکھتا تھا اور مضامین کو رَدّ یا قبول کرنے کا بھی مجھے پورا اختیار تھا۔

مولانا تاجور کا دل مذہبی اور علاقائی تعصب سے بالکل پاک تھا۔ پنجاب میں اردو کے فروغ میں ان کا حصہ مولوی محمد حسین آزاد کے بعد غالباً سب سے زیادہ ہے۔ ان کے دوستوں اور نیازمندوں میں مسلمانوں سے کہیں زیادہ ہندو اور سکھ تھے اور یوپی والوں سے کہیں زیادہ پنجابی۔ ایک بار اپنے نوٹ میں اردو کے پنجابی اہلِ قلم کے متعلق انھوں نے کچھ سخت باتیں لکھ دیں۔ یہ نوٹ مجھے ملا تو میں نے احتجاج کیا کہ جس رسالے کا مدیرِ معاون پنجابی ہو اس رسالے میں یہ تحریر شائع نہیں ہونا چاہیے۔ مولانا کا فوراً جواب ملا کہ آپ رسالے کے ایڈیٹر ہیں اور میں آپ کا مضمون نگار، آپ کو میری تحریر مسترد کرنے کا حق بھی ہے اور اس میں ترمیم کا بھی... یہ ان کی کشادہ دلی کی ایک مثال ہے۔

دفتری امور کے سلسلے میں مولانا سے کچھ زیادہ ملنا نہیں ہوتا تھا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں ان کے فیضانِ صحبت سے محروم رہا۔ جب بھی کوئی اہم ادیب یا شاعر ان سے ملنے آتا تو وہ مجھے بھی بلا لیتے۔ شام کے بعد یوں بھی میں اکثر ان سے ملنے چلا جاتا تھا۔ اگر میں یہ اعتراف نہ کروں تو بڑی ناشکر گزاری ہوگی کہ میرے ادبی ذوق کی نشو ونما میں ان صحبتوں کا بڑا دخل ہے۔

مولانا دھڑلّے کے آدمی تھے اور ظاہر ہے کہ ایسا آدمی دوستوں کے ساتھ دشمن بھی بناتا ہے اور دشمن دوستوں سے زیادہ بااصول اور سرگرم ہوتے ہیں۔ مولانا کے سب سے بڑے حریف حفیظ جالندھری تھے... دونوں میں ہمیشہ چپقلش رہی۔ لاہور کے تقریباً سبھی ادیب اور شاعر ان میں سے کسی ایک کے دوست اور دوسرے کے دشمن تھے۔ میں ان معدودے چند لوگوں میں تھا جن کے ان دونوں کے ساتھ اچھے مراسم تھے۔ یاد پڑتا ہے کہ جب میں نے 'شاہکار' کی ملازمت اختیار کی تو اس کے بعد پہلی ہی ملاقات میں حفیظ نے پوچھا:

''تم وہاں بیٹھ کر میری بُرائی کرتے ہو گے؟''

جواب میں میں نے کہا تھا: ''کیا کبھی میں نے تمھارے سامنے تاجور کی بُرائی کی ہے؟'' میرے اس جواب نے حفیظ کو مطمئن کر دیا تھا اور واقعہ یہ ہے کہ میں نے یہ اصول بنائے

رکھا کہ ان کی باہمی چپقلش سے الگ رہ کر دونوں ہی کے ساتھ اپنے نیازمندانہ تعلقات قائم رکھوں۔

مولانا تاجور کا یہ کہنا تھا کہ جن لوگوں نے ان کی ملازمت کی وہ ان کی ملازمت چھوڑنے کے بعد گردشِ روزگار کا شکار ہی رہے۔ خدا کا شکر ہے کہ میرا شمار ان لوگوں میں نہیں لیکن میں ان سے لڑ کر الگ نہیں ہوا تھا۔ ملازمت کا تعلّق ختم ہونے کے بعد بھی وہ مجھے اپنے نیاز مندوں کے زمرے میں شمار کرتے رہے۔ اور میرے دل میں بھی آج تک ان کے لیے ویسا ہی احترام ہے۔

کرن دیوان کے ساتھ بھی میرا اچھا نباہ ہوا۔ میں ان کی مالی مشکلات سے آگاہ تھا اس لیے جس ماہ وہ مجھے پوری تنخواہ نہ دے سکتے تھے میں کوئی احتجاج نہ کرتا تھا۔ 'جگت لکشمی' سے وابستگی کا سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ ایک آراستہ کمرہ اٹھنے بیٹھنے کے لیے میسّر آ گیا تھا۔ سینما کے 'پاس' بھی مجھے مل جاتے تھے۔ خود بھی دیکھتا اور کبھی کبھی اپنے ادیب دوستوں کو بھی ساتھ لے جاتا۔ ادارتی صفحات پر میری اجارہ داری تھی۔ دوستوں کے حق میں اور دشمنوں کے خلاف جو چاہتا لکھ دیتا۔ صرف فلمی معاملات میں مجھے کرن دیوان کی مصلحتوں کا ساتھ دینا ہوتا تھا۔

فلمی جرائد میں ان دنوں یہ عام رواج تھا کہ افسانے اور نظمیں غزلیں وغیرہ ادبی جرائد سے نقل کر لی جاتی تھیں۔ 'جگت لکشمی' میں بھی یہی ہوتا تھا اور ادیب یا شاعر اس پر معترض نہیں ہوتے تھے بلکہ وہ اُلٹے خوش ہوتے کہ انھیں ایک اور حلقے میں شہرت مل رہی ہے۔ کرشن چندر میرے دوست تھے۔ ان کا ہر افسانہ میں 'جگت لکشمی' میں نقل کر دیا کرتا تھا۔ ایک بار انھوں نے 'قبر' کے عنوان سے ایک افسانہ لکھا۔ میں نے اس افسانے کو 'سچی کہانی' کے عنوان سے شائع کر دیا اور کچھ ضمنی عنوان بھی قائم کر دیے۔ جس روز 'جگت لکشمی' کا یہ شمارہ شائع ہوا اس کے دوسرے تیسرے دن کرشن چندر اور کنہیا لال کپور سے ملاقات ہوئی تو کپور بری طرح برہم تھے۔ ہوا یہ تھا کہ کرشن چندر نے کہانی میں ان کا ہی نہیں، ان کے گاؤں کا نام بھی لکھ دیا تھا۔ یہ کہانی 'سچی کہانی' کے عنوان سے شائع ہوئی تو رشتہ داروں اور جان پہچان کے لوگوں میں پروفیسر صاحب کی کافی رسوائی ہوئی۔ بہرحال کپور کا غصہ دیرپا نہیں تھا وہ جلد ہی من گئے۔ کہنے لگے جب میں نے یہ پرچہ دیکھا تو پہلے

جی میں آیا کہ اس کی تمام کاپیاں خرید کر جلا ڈالوں۔ لیکن پھر سوچا کہ اس سے تو 'جگت لکشمی' کو اُلٹا فائدہ پہنچے گا۔ مقدمے کی سوجھی تو خیال آیا کہ اور رسوائی ہوگی۔ تمھاری پٹائی اس لیے نہیں کرسکتا کہ تم مجھ سے طاقتور ہو، لہٰذا معاف ہی کیے دیتا ہوں۔

'شاہکار' کے دفتر کے قریب ہی ایک ریستوران تھا جو عرب ہوٹل کہلاتا تھا۔ یہ لاہور کے آڑے ترچھوں کا اڈّہ تھا۔ ان میں زیادہ تر ادیب، شاعر اور صحافی تھے جو ایسے اداروں میں کام کرتے تھے جہاں تنخواہ قلیل ملتی تھی، بروقت نہیں ملتی تھی اور کسی ماہ ناغہ بھی ہو جاتا تھا۔ لیکن یہ اپنے حال میں مست رہتے تھے اور اپنی زندہ دِلی پر غمِ زمانہ کی پرچھائیاں نہیں پڑنے دیتے تھے۔

عرب ہوٹل بڑا ہی غریب نواز تھا۔ دو کبابوں، نصف نان اور چائے کی ایک پیالی میں صبح کا ناشتہ ہو جاتا تھا اور بھنے ہوئے گوشت کی نصف پلیٹ اور ایک نان میں ایک وقت کا کھانا۔ وہاں کے بیٹھنے والوں میں بھائی چارہ بھی بہت تھا۔ اگر کسی کی جیب میں پیسے نہیں ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ چائے سگریٹ یا کھانے سے محروم رہے... چراغ حسن حسرت اس مجلس کے میر تھے۔ انھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ 'الہلال' میں کام کیا تھا۔ 'زمیندار' میں وہ فکاہات کے عنوان سے مزاحیہ کالم لکھتے تھے جس کی ان دنوں بڑی دھوم تھی۔ اس کالم میں اتحاد پارٹی کا انھوں نے جو قصیدہ لکھا تھا وہ زبان زدِ خاص و عام تھا۔

تیرا یار نریندر ناتھ، اتحاد پارٹی
سارے ٹوڈی تیرے ساتھ، اتحاد پارٹی

اپنے اسی انداز میں انھوں نے پنجاب کا سیاسی جغرافیہ بھی لکھا جس میں پنجاب کی سیاسی شخصیتوں پر بہت دلچسپ چوٹیں کی تھیں۔ زبان پر انھیں بلا کا عبور تھا۔ کچھ دیومالائی کہانیاں بھی لکھی تھیں۔ یہ کہانیاں انھوں نے ٹھیٹ اردو میں لکھی تھیں لیکن اگر اس کتاب کو دیوناگری میں چھاپ دیا جاتا تو ہندی والے انھیں ہندی کا بڑا لکھاڑی ماننے پر مجبور ہو جاتے۔ ادب اور سیاست میں ان کی معلومات وافر تھیں۔ قدرتی تھا کہ ایسا آدمی مبتلائے زعم ہو جائے چنانچہ وہ اپنے سوا کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے اور قول و فعل کے ہر تضاد کو اپنے لیے روا رکھتے تھے۔ یہ ان کا عام شیوہ تھا کہ رمضان کے دنوں میں عرب ہوٹل میں چائے کی پیالی سامنے رکھ لیتے، چسکیاں لیتے رہتے اور

روزے کے فضائل بیان کرتے جاتے۔ ان کے کمال کے سبھی معترف تھے اس لیے کوئی حرف گیری نہیں کرتا تھا۔

میری ان کی ملاقات کی ابتدا نوک جھونک سے ہوئی۔ مجھے ان دنوں نزلہ اکثر رہتا تھا۔ کسی نے مجھے بہکا دیا کہ دائمی نزلے کا تیر بہدف علاج کسی مشہور ڈاکٹر نے یہ بتایا ہے کہ آدمی سر پر پگڑی باندھنے لگے۔ میں نے اس نسخے کو آزمانے کا فیصلہ کرلیا۔ انہی دنوں عرب ہوٹل میں میری آمد و رفت شروع ہوئی۔ دوسرا تیسرا دن تھا کہ حسرت صاحب نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا کر کہا: ''جوتشی جی! ذرا میرا ہاتھ تو دیکھ لیجیے۔'' میں نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور چند منٹ غور سے دیکھنے کے بعد جواب دیا: ''حسرت صاحب! میں مجبور ہوں، آپ نے تو کثرتِ استعمال سے اپنے ہاتھ کی لکیریں ہی مٹا ڈالی ہیں۔'' عرب ہوٹل کے قلندر غالب کے طرفدار سہی لیکن سخن فہم بھی تھے۔ میرے فقرے پر اس زور کا قہقہہ پڑا کہ چھت ہل گئی۔ خود حسرت صاحب نے بھی بات کا مزہ لیا اور اس کے بعد ان کی میری اچھی خاصی دوستی ہوگئی۔

عرب ہوٹل کے حاضر باشوں میں ایک انتہائی دلچسپ شخصیت باری علیگ کی تھی جو خود کو اشتراکی ادیب لکھتے تھے۔ اصلی نام غالباً عبدالباری تھا۔ اشتراکی بنے تو عبدیت پر سے ان کا ایمان اٹھ گیا اور صرف باری رہ گئے۔ 'کمپنی کی حکومت' کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جو کئی بار چھپی۔ کچھ کتابچے بھی انھوں نے لکھے اور مختلف اخباروں میں بھی کام کرتے رہے تھے۔ بڑے ہی آزاد خیال اور قلندر صفت آدمی تھے۔ جن دنوں وہ 'شہباز' میں کام کرتے تھے، کچھ دوستوں نے کہا کہ اگر وہ پینٹ اتار کر 'شہباز' کے دفتر سے عرب ہوٹل تک ہو آئیں تو، ایک شاندار دعوت ہوگی۔ باری واقعی تیّار ہوگئے اور جو کہا تھا کر گزرے۔ اس کا طریقہ انھوں نے یہ اختیار کیا کہ چلتے چلتے سینہ کوبی کرتے جاتے تھے اور 'یا علی یا علی' کے نعرے بھی لگاتے جاتے تھے۔ راہ گیروں نے مجذوب سمجھ کر نظر انداز کر دیا اور وہ شرط جیت گئے۔

سیاسی بحث میں قلندروں کے درمیان تلخی پیدا ہوتے کبھی نہیں دیکھی۔ اس کی وجہ غالباً یہ بھی تھی کہ وہ اپنے محدود دائرے سے باہر کی ہر جگہ کو غیر حقیقی سمجھتے تھے۔ اگر کبھی کوئی ناواقفِ آدابِ قلندری محفل میں آ دھمکتا اور کسی بات پر مشتعل ہو اٹھتا تو رنگِ محفل دیکھ کر اس کی طبیعت از خود

اعتدال پر آ جاتی تھی۔۔۔ احسان دانش کے ایک شاگرد نے موچی دروازے کے پاس 'منزل' کے نام سے ایک ریستوران کھول رکھا تھا۔ کبھی کبھی قلندروں کا قافلہ ادھر بھی جا نکلتا۔ ایک دن محفل وہاں سجی ہوئی تھی اور حسبِ معمول دنیا کی ہر چیز کا مذاق اڑایا جا رہا تھا کہ یکا یک پاس کی میز سے ایک نوجوان اٹھا اور خالی کرسی پر بیٹھ کر جوتوں سمیت اپنے دونوں پاؤں قلندروں والی میز پر دے مارے۔ وہ خاکسار تحریک میں نیا نیا شامل ہوا تھا اور یہ دیکھ کر اسے بڑا اشتعال آیا تھا کہ یہ لوگ سیاسی لیڈروں کا ذکر اس بے حرمتی سے کر رہے ہیں۔ چھوٹتے ہی بولا: ''تم کفر بک رہے ہو، میں تمھیں قتل کر دوں گا۔'' اس سے پوچھا گیا کہ آخر اسے یہ یقین کیوں ہے کہ وہ قاتل ہی ہوگا، مقتول نہیں۔ تو اس نے جواب دیا... ''میں سچّا مسلمان ہوں۔ اگر قتل ہوا بھی تو جنّت میں جاؤں گا۔'' اس مرحلے پر میری رگِ ظرافت پھڑکی اور ملتجیانہ انداز میں میں نے اس سے کہا: ''صاحبزادے! اس عمر میں جنت میں نہ جانا، جنتی کہیں آپ کو غلمان نہ سمجھ لیں۔'' اس فقرے پر قلندروں کا جو حال ہوا وہ تو ظاہر ہے لیکن اس نوجوان کا ردِّ عمل بھی مزید اشتعال کی بجائے محجوب سی ہنسی میں ظاہر ہوا۔ کوئی تین چار ہفتے کے بعد مجھے انار کلی میں ملا تو بالکل بدلا ہوا تھا۔ بڑی گرمجوشی سے مصافحہ کیا اور رازدارانہ انداز میں کہنے لگا۔ 'مثّل صاحب میں نے وہ سب کچھ چھوڑ دیا ہے۔ اب میں شراب پیتا ہوں، گانا سنتا ہوں...'' یہ میں نے بارہا دیکھا ہے کہ انتہا پسند طبائع جب ایک انتہا پسندانہ روش کو خیر باد کہتی ہیں تو فوراً ہی وہ دوسری انتہا پر پہنچ جاتی ہیں۔ کیا انسان بنیادی طور پر کبھی بدلتا ہی نہیں؟

اختر شیرانی کا اتار شروع ہو چکا تھا۔ وہ اپنے دور کے مقبول ترین شاعر تھے۔ ایک امیر اور انتہائی ذی وقار باپ کے بیٹے تھے۔ ادب اور شاعری ان کے لیے پیشہ نہیں مشغلہ تھے۔ ان کی شاعری کے رومانی ماحول، ان کی مے نوشی اور آوارہ مزاجی نے انھیں شعر و ادب کی دنیا کا رومانی شہزادہ بنا دیا تھا۔ رومانی شہزادہ بننا آسان ہے لیکن بنے رہنا اتنا آسان نہیں۔ لوگ رومانی شہزادے سے ہمہ وقت مافوق الفطرت کارناموں کی امید رکھتے ہیں۔ اور یہ کسی گوشت پوست کے انسان کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔

اپنے والد حافظ محمود خاں شیرانی سے قریب قریب ان کا قطع تعلق ہو چکا تھا۔ جو شخص دوسروں کو پانی کی طرح شراب پلاتا تھا وہ اب شراب کے لیے دوسروں کا دستِ نگر تھا۔ اس بنا پر

لوگ اختر سے کنّی بھی کترانے لگے تھے لیکن جو لوگ ان پر اس قسم کے الزام لگاتے ہیں کہ انھوں نے باقاعدہ دریوزہ گری شروع کر دی تھی، وہ غالباً ذاتی تجربہ بیان کرنے کی بجائے سنی سنائی باتیں دہراتے ہیں۔ اختر نے شرافتِ نفس کو کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ روپے پیسے کو وہ آخری وقت تک حقارت سے دیکھتے رہے۔ اور بے تکلف دستِ سوال بڑھا دینا ان کے بس ہی میں نہیں تھا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے ـــ دوپہر کے وقت میں اپنے گھر پر لیٹا ہوا تھا کہ کرشن اشر نے آکر کہا کہ نیچے اختر شیرانی آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ نیچے گیا تو اختر شیرانی تانگے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کہنے لگے ـــ آؤ چلیں۔ میں نے کہا اوپر جا کر کپڑے بدل آؤں۔ کہنے لگے نہیں ایسے ہی چلو۔ میں ان کی بات کو کم ہی ٹالتا تھا۔ تانگے میں بیٹھ گیا۔ جب تانگہ آدھ گھنٹے کے قریب چلتا رہا تو میں نے پوچھا کہ آخر جانا کہاں ہے؟ تانگہ رکواتے کیوں نہیں؟ بولے پیسے جو نہیں۔ میں نے کہا: اختر صاحب! جب میں نے کپڑے بدلنے کی بات کی تھی تو مطلب یہی تھا کہ کچھ پیسے لے لوں۔ آپ کے انکار سے میں سمجھا ضرورت نہیں۔ بہرحال تانگہ اس وقت انارکلی سے گزر رہا تھا۔ وہاں میرے ایک عزیز کی دکان تھی، میں نے اس سے پندرہ روپے اُدھار لے لیے۔ تھوڑے ہی فاصلے پر 'ملاپ' اخبار کا دفتر تھا۔ اچانک اختر کی نظر اخبار کے مالک اور ایڈیٹر رنبیر پر پڑ گئی۔ رنبیر انھیں اپنے دفتر میں لے گئے اور جب وہ واپس آئے تو ان کی جیب میں دس روپے کا نوٹ تھا لیکن شام تک یہ سب روپے خرچ ہو چکے تھے۔ جو بھی ملا اختر نے اس کی دعوت کر ڈالی۔

اختر بلانوش تھے، آوارہ گرد بھی لیکن طبعاً انتہائی شریف تھے۔ میں نے ان کی زبان سے کسی خاتون کے لیے نازیبا کلمہ کبھی نہیں سنا اور ان کی عشق کی داستانیں بھی اکثر قیاسی ہیں۔ سلمیٰ، عذرا، ریحانہ، ایک شاعر کے ذہنی ہیولے تھے۔ بہت ممکن ہے کہ ان کا پرتو اختر نے کہیں دیکھ لیا ہو لیکن وہ پوری طرح مادّی طور پر متشکل کبھی نہیں ہوئے۔ اختر تصوّف کی شاعری کے سخت خلاف تھے اور ایک مرتبہ ان کے کسی شعری مجموعے میں سے میں نے تصوّف کا ایک شعر ڈھونڈ نکالا تھا تو سخت برہم ہوئے تھے۔ لیکن محبت کی جسمانیت کے وہ ذرا قائل نہیں تھے۔ ان کی شاعری سے محبت کا جو پہلو ابھرتا ہے وہ اس کی الوہیت کا ہے، جس کا ایک ثبوت وہ نظم ہے جو انھوں نے ایک 'شاعرہ کی شادی پر' کہی ہے۔ اس نظم میں شکایت یہ نہیں ہے کہ وہ اختر کے بجائے کسی اور کی ہوگئی

بلکہ انھیں غم اس بات کا ہے کہ شاعرہ جیسی مطہر شخصیت جسمانی محبت میں ملوّث ہوگئی۔

ظلمتِ حرص ہوس حور کو بہکا ہی گئی
تیرے بستر پہ بھی آخر کو شکن آ ہی گئی

میں نے اختر کو اچھی بری ہر جگہ دیکھا ہے۔ طوائف کے کوٹھے پر بھی میں نے انھیں کبھی ضرورت سے زیادہ بے تکلّف ہوتے نہیں دیکھا۔ اگر بہت زیادہ پیے ہوتے تو اس کا ہاتھ سینے سے لگا کر رونا شروع کر دیتے۔ ایسے موقعوں پر یہ مصرعہ اکثر ان کے وردِ زبان ہوتا تھا ع

کیسے خانہ خراب ہیں ہم لوگ

بلانوشی اور لااُبالی پن کی روایت کے نئے وارث عبدالحمید عدم تھے۔ اختر شیرانی کی طرح وہ بھی چلتی پھرتی بوتل تھے۔ طبیعت ان کی انتہائی موزوں تھی۔ بلا کے زود گو تھے اور بہت عمدہ شعر بے تکلفی سے کہہ جاتے تھے۔ شراب سے انھیں بہت تعلق تھا۔ ہر وقت پیتے تھے، بے تحاشا پیتے تھے۔ لیکن شراب بالعموم ان پر کوئی ناگوار اثر نہیں ڈالتی تھی۔ ان کے بہترین اشعار بھی شراب ہی کے موضوع پر ہیں۔

عرب ہوٹل کے بعد ادیبوں کا دوسرا اڈّہ نگینہ بیکری تھی۔ نیلا گنبد لاہور میں چائے کی یہ مختصر سی دوکان یو. پی کے ایک قوم پرست مسلمان چلا رہے تھے۔ شروع شروع میں یہاں آنے والوں میں زیادہ تر کانگریسی مسلمان ہی تھے۔ لیکن پھر مسلم لیگی بھی آنے لگے اور اس طرح یہ دکان سیاسی مناظرہ بازی کا اڈّہ بن گئی۔ ادیبوں کا اڈّہ یہ تب بنی جب چراغ حسن حسرت، جو عرب ہوٹل کی مجلس کے میر تھے، سرکاری ملازمت میں چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی مجلس بھی درہم برہم ہوگئی اور وہاں سے اُکھڑ کر نگینہ بیکری میں آ جمی۔

باری علیگ جو پہلے عرب ہوٹل کے نواح میں رہتے تھے، اب پرانی انارکلی میں رہنے لگے تھے اور ان کا مکان نگینہ بیکری سے کچھ زیادہ دور نہیں تھا۔ خود میں نے بھی انارکلی میں مکان لے لیا تھا۔ عرب ہوٹل یہاں سے کافی دور تھا اس لیے میں نے اور باری علیگ نے نگینہ بیکری ہی میں ڈیرے ڈال دیے۔ باری علیگ کی کشش مولانا صلاح الدین کو بھی کھینچ لائی جن کے جریدے 'ادبی دنیا' کا دفتر بھی قریب ہی مال روڈ پر تھا۔ مولانا صلاح الدین کے ہمراہ عاشق بٹالوی اور کچھ اور ادیب

بھی آنے لگے۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ، جوان دنوں اورینٹل کالج لاہور میں تھے، پہلے ہی سے وہاں بیٹھا کرتے تھے۔ اس طرح اچھی خاصی محفل جمنے لگی۔ جوادیب وہاں باقاعدگی سے نہیں بیٹھتے تھے وہ بھی ہفتے میں ایک دوبار ضرور اُدھر آنکلتے۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ ان دنوں داڑھی رکھتے تھے اور شیروانی پہنتے تھے۔ سیاست میں قوم پرستانہ اندازِ نظر رکھتے تھے اور ان کے متعلق یہ مشہور تھا کہ مجلسِ احرار کے بہت قریب ہیں۔ مسلمانوں کی اس روش پر وہ اکثر چوٹ کیا کرتے تھے کہ اپنی ساری کوتاہیوں کا الزام وہ ہندوؤں کے سر ہی ڈال دیتے ہیں۔ ان کا مخصوص نعرہ تھا: ''سب گوپی چند نے کیا ہے۔'' (ڈاکٹر گوپی چند بھارگو جو پنجاب اسمبلی میں کانگریس پارٹی کے لیڈر تھے)

مولانا صلاح الدین سیاسی بحث میں اگرچہ شریک نہیں ہوتے تھے لیکن ادبی گفتگو میں ضرور حصّہ لیتے تھے۔ انھیں سب سے زیادہ تشویش اردو کے مستقبل کے بارے میں تھی۔ شروع شروع میں ان کا خیال تھا کہ تقسیمِ ملک سے اردو کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچے گا لیکن پھر وہ محسوس کرنے لگے کہ تقسیم میں اردو کی فلاح کے لیے ایک اشارۂ غیبی ہے۔ جب اہلِ زبان پنجاب پہنچیں گے تو پنجابیوں کو مفت کے استاد میسر آجائیں گے اور اردو کو فروغ حاصل ہوگا۔ ملک تقسیم ہوا، لاہور جلنے لگا اور مسلمانوں کے لٹُے ہوئے قافلے وہاں پہنچنے لگے لیکن مولانا کی گفتگو کا محور ایک ہی رہا... پنجاب میں اردو کا کیا بنے گا؟

اس قسم کی باتیں سن کر شروع شروع میں ان پر شقاوتِ قلب کا گمان گزرتا تھا۔ ایک ایسے وقت میں جب سارا ملک مقتل بنا ہوا تھا کوئی شخص انسانی مصائب سے اتنا بے پروا ہوجائے کہ اسے اردو کے مستقبل کے سوا اور کچھ سوجھے ہی نہیں؟ ستم بالائے ستم یہ کہ مولانا کے چہرے پر ہر وقت مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی اور غم و غصّے کے کوئی آثار نظر نہیں آتے تھے۔

ہندوؤں کو لاہور سے بھاگتے دیکھ کر انھوں نے صرف اسی قدر کہا... ''متّل صاحب! یہ لوگ آخر کیوں بھاگ رہے ہیں؟ اس بار مجھے اور بھی عجیب سا لگا۔ لیکن اسی شام مجھے باری علیگ کی زبانی ایک ایسی بات معلوم ہوئی کہ میں حیرت میں ڈوب گیا۔ مولانا کا اپنا مکان لاہور کے ایک ہندو محلے میں تھا اور جب ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے مکانوں کو آگ لگا رہے تھے تو ان کا مکان بھی جل کر راکھ ہوگیا تھا اور ان کی پیشانی پر کوئی شکن نہیں اُبھری تھی۔

جب مولانا کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی ہوتی اور وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مصائب سے بے پرواصرف اردو کے مستقبل کے بارے میں پریشانی کا اظہار کیا کرتے تو وہ دوسروں کے مصائب ہی سے نہیں، اپنے مصائب سے بھی بے نیاز ہوتے تھے۔ انھوں نے اردو کے غم کو اتنا اپنالیا تھا کہ باقی غموں سے وہ بے نیاز ہو گئے تھے۔

مولانا صلاح الدین کی برہمی دیکھنے کا اتفاق صرف ایک بار ہوا۔ فسادات کے دنوں میں بھی میرے معمولات میں فرق نہیں آیا تھا۔ میں نیلا گنبد کی اسی دکان پر چائے پیتا رہا، اور مسلمانوں کے ریستورانوں میں کھانا بھی کھاتا رہا۔ شبانہ آوارہ گردی کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ ایک رات تقریباً ایک بجے مال روڈ کے کسی ریستوران سے نکل کر گھر آرہا تھا اور نشے میں دُھت تھا۔ نیلا گنبد کے قریب پہنچا تو سامنے سے باری علیگ اور مولانا صلاح الدین آتے دکھائی دیے۔ سامنا ہوا تو مولانا نے مجھے آڑے ہاتھوں لیا اور جو کچھ بُرا بھلا کہہ سکتے تھے کہہ ڈالا۔ بس پٹائی ہی نہیں کی۔ اس کے بعد باری علیگ مجھے گھر تک چھوڑ آئے۔

دوسرے دن بھی ملاقات ہوئی تو مولانا صلاح الدین برہم تھے اور جب تک میں نے یہ وعدہ نہیں کیا کہ اب رات کے وقت گھر سے باہر نہیں نکلا کروں گا، ان کے چہرے پر مسکراہٹ واپس نہیں آئی۔ باقی بہت سی چیزوں کی طرح قلندروں نے فسادات کو بھی کافی دنوں تک غیر حقیقی ہی سمجھا۔ جیسے ہی میں نگینہ بیکری میں داخل ہوتا، باری نعرہ لگاتے:

کافر آیا چُھری نکالو

فسادات نے انتہائی زور پکڑا تو بھی انارکلی کا علاقہ محفوظ رہا۔ اس لیے نگینہ بیکری کی محفل برہم نہیں ہوئی۔ انارکلی میں فساد نہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ وہاں کے ہندو اور مسلمان دکان داروں میں سمجھوتہ ہو گیا تھا کہ بازار کو تباہ نہیں ہونے دیا جائے گا۔ چنانچہ جب باقی شہر جل رہا تھا، تب بھی انارکلی پر آنچ نہیں آئی۔ کاروبار البتّہ یہاں بھی معطل تھا اور کھانے پینے کی اِکّادکّا دکانوں کو چھوڑ کر کوئی دکان کھلی نظر نہ آتی تھی۔

ایک دن، دوپہر کو میں گھر پر بیٹھا تاش کھیل رہا تھا کہ کسی نے اطلاع دی کہ آتش زنی اور لوٹ مار کا سلسلہ انارکلی میں بھی شروع ہو گیا ہے۔ کچھ غنڈے راجا برادرز کی دکان کا، جو میرے

گھر کے قریب ہی تھی، تالا توڑ رہے تھے اور آگ لگانے کی کوشش بھی کی جا رہی تھی۔ ان دنوں فائر بریگیڈ اور پولیس کی مدد حاصل کرنا ممکن نہیں تھا اس لیے یہ یقینی نظر آتا تھا کہ اگر آگ لگ گئی تو سارا بازار جل کر رہ جائے گا۔ لیکن کراکری کی مشہور دکان بیجا مل اینڈ سنز کے مالک کی حکام رسی آڑے آ گئی۔ اس نے سپرنٹنڈنٹ پولیس کو، جو ایک انگریز تھا، براہِ راست ٹیلی فون کر دیا۔ وہ کچھ سپاہیوں کو لے کر جائے واردت پر پہنچا اور اپنے ہاتھ سے مشین گن چلا کر تین فسادیوں کو ہلاک کر دیا۔ باقی بھاگ گئے۔ آگ البتہ لگ چکی تھی مگر یہ پھیلی نہیں اور جو واحد دکان جلی وہ کسی ہندو کی نہیں بلکہ مسلمان کی تھی۔

فسادیوں کی لاشیں اگلے دن بھی بازار ہی میں پڑی رہیں، شاید لوگوں کو عبرت دلانے کے لیے۔ تینوں لاشیں نچلے طبقے کے مسلمانوں کی تھیں جو لباس اور وضع قطع سے پیشہ ور غنڈے معلوم ہوتے تھے۔

انارکلی کو بچانے میں ایک انگریز افسر کی تنہا فرض شناسی کو دخل تھا۔ لیکن یہ بات بدستور سنی جاتی رہی کہ فسادات انگریز کرا رہے ہیں۔

انارکلی کے دکان داروں کا سمجھوتہ اس واقعے کے بعد بھی برقرار رہا اور خنجر زنی کے اِکّا دکّا واقعات کو چھوڑ کر یہاں فساد نہیں ہوا۔ ہندو بہر حال سہمے ہوئے تھے اور اس سکون کو آنے والے طوفان کا پیش خیمہ سمجھ رہے تھے۔ فسادات کی در پردہ تیّاریوں کا شبہ ایک مسلمان رئیس کے بیٹوں پر تھا جس کی انارکلی میں کافی جائداد تھی۔ ان میں سے ایک کبھی کبھی نگینہ بیکری میں بھی آیا کرتا تھا۔ اس واقعے کے دو تین دن بعد ملا تو کہنے لگا... ''متّل صاحب! کیوں نہ آج چائے گھر چل کر ہی پئیں''۔ میں ساتھ ہو لیا۔ ان لوگوں کی کوٹھی بہت بڑی تھی اور خود اس کا کمرہ اوپر کی منزل پر تھا جہاں پہنچنے کے لیے کئی زینوں کو عبور کرنا پڑتا تھا۔

کمرے میں پہنچتے ہی کہنے لگا... ''تم جانتے ہو کہ میں تمھیں یہاں کیوں لایا ہوں؟'' میں نے کہا: ''قتل کرنے کے لیے۔'' میرے جواب پر ہنس پڑا اور یہ ہنسی اس کی دلی مسرّت کی آئینہ دار تھی۔ کہنے لگا کہ ''میں خوش ہوں کہ کم از کم ایک ہندو مجھے قاتل نہیں سمجھتا۔ میں تمھیں یہاں آج اس لیے لایا تھا کہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کروں۔ یہ بتاؤں کہ مجھ پر فساد کی در پردہ تیّاریوں کا جو

الزام ہے وہ غلط ہے۔''

انار کلی پُرسکون سہی لیکن اندرونِ فصیل قیامت کا عالم تھا اور ہندوؤں کے بازار یکے بعد دیگرے جلائے جارہے تھے۔ جب تک ہندوؤں کو یہ خیال رہا کہ لاہور ہندوستان ہی میں رہے گا وہ وہاں ڈٹے رہے۔ لیکن جب لاہور کے بارے میں فیصلہ ہوگیا کہ وہ پاکستان میں جائے گا تو ان کے قدم اُکھڑ گئے۔ پھر اونچی سطح پر، خواہ مضمر طور پر ہی سہی، تبادلۂ آبادی کا فیصلہ بھی ہوگیا اور جانے والوں کے لیے سرکاری ٹرک مہیّا کر دیے گئے۔ اب ہندوؤں کے وہاں رہنے کا سوال ہی نہیں تھا۔

میرا اٹھنا بیٹھنا چونکہ زیادہ تر مسلمانوں میں تھا اس لیے وہ مسلمان جو میرے ذاتی دوست یا شناسا نہیں تھے، مجھے مسلمان ہی سمجھتے تھے۔ اور ایک بار ایک دلچسپ صورتِ حال پیدا ہوگئی۔ 15/اگست کو میں نگینہ بیکری میں صبح کا ناشتہ کر رہا تھا اور محفل جمی ہوئی تھی کہ یکایک دو تین غنڈہ صورت مسلمان داخل ہوئے اور ہماری میز کے قریب ہی بیٹھ گئے۔ پھر ہماری گفتگو میں بھی شریک ہوگئے۔ اور اپنے قتل و غارت گری کے کارنامے فاتحانہ انداز میں سنانے لگے۔ ان میں سے ایک خصوصیت سے میری طرف مخاطب تھا اور ایک گردوارے پر حملے کی روداد سنا رہا تھا۔ اس کا بیان تھا کہ گردوارے والوں کے پاس کافی اسلحہ تھا اور وہ اپنے بچاؤ کے لیے متواتر گولیاں چلاتے رہے۔ لیکن گولیاں آخر ختم ہوگئیں جس کے بعد وہ اور اس کے ساتھی دیوار پھاند کر گردوارے کے اندر گئے اور سکھوں کو ایک ایک کر کے ذبح کر ڈالا۔

خدا جانے اس کا سبب میرا اپنے مسلمان دوستوں پر کامل اعتماد تھا یا دیوانگی کی کوئی ترنگ کہ میں نے اسے بتا دیا کہ جس شخص کو وہ یہ روداد سنا رہا ہے وہ ایک ہندو ہے۔ اس کا لہجہ فوراً ہی بدل گیا، کہنے لگا کہ: ''اگر تم سے پرسوں ملاقات ہوئی ہوتی تو میں تمھیں ضرور قتل کر دیتا۔ لیکن کل پاکستان قائم ہوگیا ہے، اب تم میرے مہمان ہو۔ میرے گھر چلو، میں تمھاری تواضع کروں گا اور اگر کوئی تم پر انگلی اٹھائے گا تو اس کا سر کاٹ دوں گا۔'' اپنی انٹی سے نکال کر مجھے کچھ گولیاں بھی دکھائیں۔ کہنے لگا: ''یہ ان میں سے چند گولیاں ہیں جو تمھارے بھائی بند ہم پر چلاتے رہے ہیں۔''

قلندروں پر فسادات کا صرف اتنا اثر ہوا کہ اب میری آمد پر 'باری علیگ' کا فرآیا چھری نکالو' کا نعرہ بلند نہیں کرتے تھے، صرف ذمّی بنانے کی دھمکی دیتے تھے جس پر میں کہا کرتا تھا: ''ابے

چل! تو خود کسی نواب ممدوح کا کمیرا ہوگا۔'' یہ خوش فہمی ابھی قائم تھی کہ جو ہندو بھاگے بھی ہیں واپس آ جائیں گے اور لاہور ویسا کا ویسا ہی رہے گا۔

لیکن اس خوش فہمی نے زیادہ دن ساتھ نہیں دیا۔ لاہور سے ہندو بھاگ ہی نہیں رہے تھے، باہر سے مسلمان آ بھی رہے تھے۔ لاہور کا نقشہ یکسر بدل رہا تھا۔ مجھے ذمّی بنانے کی دھمکی دینے کی بجائے باری اب اپنے اس ڈر کا اظہار کرنے لگا تھا: ''یار متّل! کہیں داڑھی نہ رکھنا پڑے۔''

فسادیوں نے اس بستی پر، جس میں پروفیسر برج نرائن رہتے تھے، حملہ کیا تو انھوں نے یہ دلیل دے کر فسادیوں کو آتش زنی اور قتل وغارت سے باز رکھنے کی کوشش کی کہ جن مکانوں کو تم جلا رہے ہو وہ پاکستان کا اثاثہ ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ فسادی پہلے تو پروفیسر صاحب کی بات مان کر واپس چلے گئے لیکن وہی خود یا فسادیوں کی کوئی دوسری ٹولی دوبارہ آئی تو پروفیسر صاحب انھیں قائل کرنے میں ناکام رہے اور سب سے پہلے خود ہی قتل ہوئے۔

پروفیسر برج نرائن عالمی شہرت کے ماہرِ اقتصادیات تھے جہاں بیشتر ماہرینِ اقتصادیات یہ کہتے تھے کہ پاکستان اقتصادی طور پر کبھی مستحکم نہیں ہو سکے گا اور اس کا وجود بڑا ہی ناپائدار ہے۔ وہاں پروفیسر برج نرائن نے اس نظریے کی حمایت میں متعدد مضامین لکھے تھے کہ پاکستان اقتصادی طور پر خود کفالت کا اہل ہوگا۔ وہ پاکستان میں رہنے کا فیصلہ کیے ہوئے تھے اور ان کی بے تعصبی کا کٹّر سے کٹّر مسلم لیگی قائل تھا۔ بہت ممکن تھا کہ وہ زندہ رہتے تو پاکستان کے اقتصادی استحکام کا کام انہی کے سپرد ہوتا۔ لیکن قضا وقدر کو یہ منظور نہیں تھا۔

پروفیسر برج نرائن کی موت میرے لیے زبردست دھچکا تھی۔ وہ میرے استاد تھے اور میرے مزاج کی تشکیل میں ان کا بڑا ہاتھ تھا۔ گھر والے لاہور میں رہنے کو پہلے بھی تیار نہیں تھے، اب میرے قدم بھی ڈگمگا گئے اور جب امرتسر جانے والا لاریوں کا آخری قافلہ روانہ ہوا تو اس میں ہم بھی سوار تھے۔ مجھے الوداع کہنے کچھ مسلمان دوست بھی آئے تھے۔ ان میں سے دو ایک کی آنکھیں اشک بار تھیں۔ ایک ہمسفر نے سرگوشی کے انداز میں مجھ سے کہا: ''سالے پہلے مار مار کر بھگاتے ہیں پھر روتے ہیں۔'' مجھے غصہ آ گیا اور میں نے کہا: ''بکومت۔'' یہ فیصلہ میں آج تک

نہیں کر سکا کہ یہ جھاڑ میں نے اسے ڈالی تھی یا خود اپنے آپ کو کیونکہ دل اندر ہی اندر کچھ ایسا محسوس کر رہا تھا کہ میں قلندروں کو جُل دے کر جا رہا ہوں۔

قافلہ امرتسر پہنچا تو وہاں بھی جلے ہوئے مکان نظر پڑے۔ لاہور میں پیشانی پر نورِ شہادت پیدا نہیں ہوا تھا لیکن یہاں آ کر ندامت کے قطرے ضرور نمودار ہو گئے۔ پتہ چلا کہ اسی قافلے میں راج بلدیوراج بھی شامل ہیں۔ جہاں قافلہ رُکا تھا وہاں اچھا خاصا بازار لگا ہوا تھا۔ ہم دونوں منہ ہاتھ دھو کر چائے پینے بیٹھ گئے۔ قافلے والے لٹ لٹا کر آئے تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لٹیرے خود ان میں بھی موجود ہیں۔ کسی کا ٹرنک غائب تھا کسی کا بستر۔ ہم اس پر طنزیہ انداز میں تبصرہ کر رہے تھے کہ قریب ہی سے آواز آئی: ''اب لاہور پر حملہ کرنے چلیں گے۔'' میں نے پوچھا: ''راج! ہم حملہ کرنے کب جا رہے ہیں؟'' کہنے لگا: ''بھئی! کبھی مشاعرہ پڑھنے چلیں گے۔''

راج بلدیوراج کے بارے میں مجھے علم نہیں لیکن میں مشاعرہ پڑھنے لاہور جا چکا ہوں۔

دہلی میں کچھ دنوں تک 'ملاپ' اور 'تیج' میں کام کرنے کے بعد مارچ 1953 میں میں نے 'تحریک' جاری کیا جس کا حال ہی میں سِلور جبلی نمبر شائع ہوا ہے۔ 'تحریک' کے بارے میں کیا لکھوں، میری داستانِ رسوائی کا یہ حصّہ بے شمار لوگوں کو قریب قریب از بر ہے۔

۞۞

گوپال متل بطور صحافی

گوپال متّل کی شخصیت کا مطالعہ کرنے والے اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ وہ ایک سچّے، بے باک اور مخلص صحافی تھے۔ لاہور میں بی اے کے امتحان میں کامیابی حاصل کر لینے کے بعد انھوں نے لدھیانہ سے ایک ادبی رسالہ 'صبحِ امید' کا اجرا کیا۔ ان کی صحافتی اور ادبی زندگی کا آغاز اسی سے عبارت ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ 'صبحِ امید' کا یہ پہلا شمارہ ہی آخری شمارہ بھی ثابت ہوا۔

گوپال متّل نے لاہور میں اپنی طویل صحافتی زندگی میں روزنامہ 'ملاپ'، 'نیشنل کانگریس'، 'چترا ویکلی'، 'بھارت ماتا'، 'جگت لکشمی' وغیرہ میں کام کیا۔ وہاں وہ 'ادبِ لطیف' اور 'شاہکار' کی ادارت سے بھی وابستہ رہے۔

دہلی پہنچ کر پتا جی کے دل میں ماہانہ رسالہ نکالنے کی للک پھر پیدا ہوئی لیکن وسائل نہ بن پانے کے باعث روزنامہ 'ملاپ' اور پھر روزنامہ 'تیج' سے وابستہ ہو گئے اور وہاں سے جو کچھ یافت ہوتی اس میں سے پس انداز کر کے 1949 میں بالآخر 'تحریک' کا اجرا کیا۔ لیکن 'تحریک' کا یہ شمارہ اس کا آخری شمارہ بھی ثابت ہوا، معاملہ وہی وسائل کا تھا۔ کچھ دن بعد سور گیہ گوپی ناتھ امن صاحب کی کوششوں سے مہاجر ادیبوں کے لیے ڈھائی ہزار روپے کا لون حکومت کی طرف سے منظور کیا گیا۔ امن صاحب اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز تھے اور اس سلسلے میں بااختیار تھے۔ انھوں نے

پتا جی کو خود ہی آمادہ کیا۔ پتا جی نے اس لون کا صَرف 'تحریک' کی تجدید میں کیا اور مارچ 1953 میں 'تحریک' کی باقاعدہ اشاعت شروع ہوئی، جو جنوری 1980 تک یعنی چھبیس سال تک برابر جاری رہی۔ یہ رسالہ ابتدا میں ڈپٹی گنج کے گھر کے پتے سے ہی جاری کیا گیا، جہاں پتا جی ہی اس کے ایڈیٹر، پروف ریڈر، ڈسپیچر، کلرک اور چپراسی سب کچھ تھے۔ اوپر جس لون کا ذکر کیا گیا اسے بعد میں پتا جی نے باضابطہ واپس بھی لوٹایا، اور میرے خیال میں یہ لون واپس لوٹانے والے معدودے چند لوگوں میں سے وہ ایک تھے۔

گوپال متّل تقریباً نصف صدی اردو صحافت سے وابستہ رہے۔ اپنی اس طویل صحافتی زندگی میں انھوں نے مختلف شعبوں میں کام کیا۔ تحریک کی فائلوں سے کچھ ادب پارے درج ذیل میں دے رہا ہوں، جن سے وہ ایک بے باک اور متوازن مبصّر اور ناقد کی حیثیت سے اُبھرتے ہیں۔ ان میں استدلال ان کا سب سے بڑا ہتھیار نظر آتا ہے:

- ہر چند کہ ادب کا بنیادی مقصد احساسِ جمال کی تسکین ہے۔ اور یہ مقصد سماجی اہمیت اور افادیت سے خالی نہیں۔ لیکن اگر ادب اس کے علاوہ کوئی اور مقصد بھی انجام دے تو اس سے کسی کو اختلاف کی گنجائش نہیں۔ (تحریک، اپریل 1953)

- صرف یہی کیا کم ہے کہ اردو ادیبوں کے دل میں ادبی تخلیق کی سچّی لگن پیدا ہوگئی ہے اب اگر تخلیق کی رفتار سست بھی ہے تو اسے جمود و تعطّل کا نام نہ دیجیے۔ کارواں رُکا نہیں بلکہ روانہ ہونے کے لیے رختِ سفر باندھ رہا ہے۔ (تحریک، جنوری 1955)

- ادب کسی رقیب کو برداشت نہیں کرتا۔ اگر کوئی اسے اپنانا چاہتا ہے تو اسے اس کا بن کر رہنا پڑے گا۔ اخلاص کی شرط کو پورا کرنے کے بعد اس بحث کی گنجائش خود ختم ہو جاتی ہے کہ نئی ادبی تحریک کا مقصد کیا ہو؟ اصل نکتہ یہی ہے کہ ادب کو ایک عقیدہ مان لیا جائے۔ ظاہر ہے کسی شخص کے عقائد اس عقیدے سے براہِ راست متصادم ہوں گے تو وہ ادب کی بارگاہ میں باریابی حاصل کرنے میں ناکام رہے گا۔ (تحریک، جنوری 1955)

- جب زندگی میں تضاد ہے تو طبائع میں اختلاف کیوں نہ ہو اور اگر طبائع میں اختلاف ہے تو اس کا اظہار ادب میں کیوں نہ ہو؟ ادب تو پنپتا ہی تب ہے اگر ادیب کو دل کی بات کہنے کی کھلی آزادی حاصل رہے۔ ہم سرخ یا زرد فاشسٹ نہیں کہ ادیبوں پر اس قسم کی پابندی عائد کریں کہ وہ یہ لکھیں اور یہ نہ لکھیں۔ (تحریک، نومبر 1953)

- جمہوریت کی شرط کسی خاص عقیدے یا نقطۂ نظر کو اپنانا نہیں بلکہ نقطہ ہائے نظر اور عقائد کے اختلاف کو تسلیم کرتے ہوئے رواداری کے اصول پر کاربند ہونا ہے۔ جمہوریت کی شرط یہ نہیں کہ اپنے نقطۂ نظر کو دوسروں پر ٹھونسا جائے بلکہ اپنے عقائد کی پابندی کرتے ہوئے دوسروں کے عقائد کو برداشت کرنا ہے۔ کمیونزم کے خلاف ہماری سب سے بڑی شکایت یہی ہے کہ اس نے مارکس، لینن اور اسٹالن کی باتوں کو حرفِ آخر قرار دے کر آزادیِ فکر و نظر کے تمام دروازے بند کر دیے۔ (تحریک، اپریل 1954)

- کمیونزم کی مخالفت کو منفی رویّہ قرار دینا بہت بڑی زیادتی ہے۔ جمہوریت کا ارتقا انسان کی ہزار ہا سال کی مسلسل جدوجہد کا نتیجہ ہے۔ اس عظیم ورثے کا تحفظ اور اسے مٹانے والی تحریکوں کی مخالفت بڑا ہی مثبت کام ہے۔ (تحریک، اپریل 1954)

- ادبِ عالیہ ہمیشہ داخلی عمل ہوتا ہے جس میں شعوری کوشش سے کہیں زیادہ تحت الشعور کو دخل ہوتا ہے۔ اس کا نہ کوئی افادی پہلو ہوتا ہے نہ سماجی مقصد۔ میرا جی اردو کے نقادوں کی نگاہ میں لاکھ مردود ہوں لیکن ادبی اقدار ان کے ماتھے پر عظمت کا تاج رکھ کر رہیں گی۔ وہ تمام بونے جنھیں تاریخی قدروں کے نام پر اردو کے نقّادوں نے دیوقامت ثابت کیا تھا جیتے جی مر گئے اور مرتے مرتے اپنے مدّاحین کے چہروں پر خجالت کی سیاہی چھوڑ گئے لیکن میرا جی جس کا واحد مصرف یہ تھا کہ ان نقادانِ فن کی گالیوں کا موضوع بن سکے، اپنی موت کے باوجود کسی وقت بھی زندہ پائندہ شاعروں کی صف میں شامل ہو سکتا ہے۔ (تحریک، اگست 1954)

- گزشتہ کئی سال سے اردو ادب میں سطحیت آ رہی تھی اور زندگی کا براہِ راست مطالعہ کرنے

کے بجائے نعروں کا سہارا لیا جا رہا تھا۔ مزید برآں اردو میں لکھنے والے ادیب اپنی زبان کے قدیم ادب سے بے خبر تھے اور فارسی تو ان کے نزدیک ممنوعہ شجر تھی۔ نئے ادیب جہاں نعروں کا سہارا لینے کے بجائے زندگی کا براہِ راست مطالعہ کر رہے ہیں وہاں اپنی زبان کے قدیم ادب کی طرف بھی رجوع کر رہے ہیں۔ (تحریک، جنوری 1955)

- ادب کو زندگی کا ترجمان بنانے کے لیے زندگی کا براہِ راست مطالعہ اور ایک طرح کی غیر جانبداری بہت ضروری ہے۔ (تحریک، مارچ 1955)

- ادیب کے فرائض کو فیصلہ کرنے سے پہلے خود ادب کے مقصد کا فیصلہ کرنا چاہیے۔ یہ بات آسان نہیں۔ :لیکن ادب کی اس تعریف سے بہت کم لوگوں کو اختلاف ہوگا کہ اس کا مقصد احساسِ جمال کی تسکین ہے۔ ایسا ادب پیدا کرنا جو طہارتِ فکر کا آئینہ دار اور اس کے اظہار کا انداز بھی حسین وجمیل ہو، سماجی اعتبار سے بھی بہت بڑی افادیت رکھتا ہے۔ اس طرح ادیب نہ صرف اپنی شخصیت کا اظہار کر کے شخصی ارتقا کی منزلیں طے کرتا ہے بلکہ قوم کے جذباتِ لطیف سے اپیل کر کے بہتر سماجی ماحول کی تخلیق میں مدد بھی دیتا ہے اور قوم کے جذباتی توازن کو برقرار رکھنے کے لیے بھی مفید ثابت ہوتا ہے۔ (تحریک، اپریل 1955)

- اچھے اور قدآور ادب کی تخلیق کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ روایت کے ساتھ ہمارا تعلّق قائم رہے۔ ہر نئی چیز سے پہلوتہی کرنا قدامت پسندی ہے اور یہ قدامت پسندی نہ ادیب کے لیے مفید ہوسکتی ہے اور نہ قوم کے لیے۔ لیکن جدیدیت اور نئے پن کے لیے اپنے روحانی ورثے کو فراموش کر دینا بھی دانشمندی نہیں۔ (تحریک، اپریل 1955)

- غلو ہر بات میں برا ہوتا ہے اور اس کی بدولت بعض بہت اچھی باتیں بھی بسا اوقات اپنے حقیقی مفہوم سے محروم ہو جاتی ہیں۔ خالی قوم پرستی میں بھی یہ خطرہ موجود ہے۔ قوم پرستی کا یہ تقاضا ہے کہ جو لوگ اس کے مدّعی ہوں وہ دوسرے لوگوں کے مقابلے میں زیادہ وسیع القلب اور زیادہ

عالی ظرف ہوں۔ اگر قوم پرست بننے کے بعد اپنے مختصر سے گروہ کے باہر ہر شخص تنگ نظر اور فرقہ پرست نظر آنے لگے تو یہ قوم پرستی اصلاحِ احوال کا باعث نہیں بن سکتی۔ اور ایک نئی قسم کی گروہ بندی کی بنیاد ڈالنے کی موجب بن سکتی ہے۔

- کمیونسٹ اور غیر کمیونسٹ ادیبوں میں بنیادی نظریاتی فرق یہ ہے کہ جہاں جمہوری ادیب یہ مانتے ہیں کہ ادب اپنے ضمیر کے ماسوا اور کسی کا پابند نہیں وہاں کمیونسٹوں کے نزدیک ادب سیاست کی لونڈی ہے اور ادیبوں پر کمیونسٹ پارٹی کے مقاصد کی تکمیل فرض ہے۔ (تحریک، ستمبر 1955)

- جمہوریت کے لیے سب سے زیادہ خطرہ کا باعث یہ مریضانہ جذبہ ہے کہ آدمی مبتلائے پندار ہوکر یہ سمجھنے لگے کہ وہ خود نیکی کا مجاہد ہے اور اس کے مخالف ابلیس کے پَیرو یہ جذبہ بالآخر اس کو ابلیس کا پیرو بنا کر دم لیتا ہے۔ جمہوریت کا سنگِ بنیاد یہ ہے کہ آدمی اس امکان کو مکمل طور پر کبھی نظر انداز نہ کرے کہ اس کی اپنی رائے غلط ہو سکتی ہے اور اس کے مخالفوں کی صحیح اس اندازِ نظر کو اپنانے کے بعد اپنے سیاسی مخالفوں پر جبر کا امکان باقی نہیں رہتا اور سماج میں بڑی سے بڑی تبدیلی بھی پُر امن طور پر ہو جاتی ہے۔ اس سے مختلف راستہ جمہوری راستہ نہیں بلکہ نرائن اور آمریّت کا راستہ ہے جو کسی بھی ملک کے لیے زہر کا حکم رکھتا ہے۔ (تحریک، فروری 1956)

- ادب برائے زندگی کے نظریے کا مطلب یہ ہوگا کہ ادب زندگی کا جزو لاینفک نہیں بلکہ اس سے الگ کوئی چیز ہے جسے دور کھڑے ہو کر یہ فیصلہ کرنا ہے کہ وہ زندگی کی ماتحتی قبول کرے گا یا اس سے الگ اپنے لیے کوئی مقام پیدا کرے گا۔ ادب برائے ادب کا نعرہ اس لیے نامکمل ہے کہ یہ ادب کو ہوا میں معلّق کر دیتا ہے۔ جہاں یہ زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتا۔ اگر ہم ادب کو زندگی کا جزو مان لیں تو یہ بحث آسانی ختم ہو جاتی ہے۔ اسے زندگی کا جزو مان لینے کے بعد یہ ضرورت باقی نہیں رہتی کہ اس پر زندگی کے باقی شعبوں کی ماتحتی لازمی قرار دی جائے۔ کیونکہ اس طرح اس کی نشو و نما ہی اجتماعی زندگی کے ارتقا کی ضامن بن جائے گی۔ (تحریک، ستمبر 1956)

● ادب مقصود بالذّات ہونے کے باوجود سماجی فریضے کا حامل ہوتا ہے۔ اس سے قوم کے احساسِ جمال کی تسکین ہوتی ہے۔ اس کا ذہنی توازن برقرار رہتا ہے۔ سرشتِ انسانی کے مثبت جوہر اُبھرتے ہیں اور منفی عناصر کے لیے ضرر اخراج میں مدد ملتی ہے۔ اس سماجی فریضے کی تکمیل کے لیے یہ بھی ضروری نہیں کہ ادیب عمداً اور دانستہ طور پر مفید ادب کی تخلیق میں مصروف ہو جائیں۔ کم از کم خارجی طور پر ان سے اس قسم کا کوئی مطالبہ نہیں کیا جانا چاہیے۔ اگر وہ واقعی ادیب ہیں تو ان کے داخلی تقاضے ہی انھیں جادۂ اعتدال سے منحرف نہیں ہونے دیں گے اور اگر وہ جادۂ اعتدال سے بھٹکیں گے بھی تو نقّاد کا قلم ان کی سرزنش کے لیے موجود ہے۔ اس سلسلے میں استثنائی مثالیں پیش کرنے سے کام نہیں چلے گا۔ اگر اس کے برعکس ادیبوں کو براہِ راست غیر ادبی فرائض تفویض کیے گئے تو وہ صرف محرّر بن کر رہ جائیں گے اور ادب کا وجود ہی خطرے میں پڑ جائے گا۔

(تحریک، ستمبر 1956)

● ہمیں یہ بات کبھی نہیں بھولنی چاہیے کہ ادیب کا بھی اپنا ضمیر ہوتا ہے۔ اس کی شخصیت کے تقاضے ہوتے ہیں جن کی وہ تکمیل چاہتا ہے۔ وہ ادب کے ذریعے صرف اپنی انفرادی شخصیت کا اظہار ہی نہیں چاہتا بلکہ صداقت کی تلاش بھی کرتا ہے۔ اب اگر اس کی تلاش کا ماحصل فلسفی اور سیاست داں کی تلاش سے مختلف نکلتا ہے تو ان دونوں گروہوں کو اس پر جز بز ہونے کی ضرورت نہیں۔ خصوصاً اس لیے کہ ادیب بیچارہ منکسرالمزاج ہوتا ہے اور اپنا دعاوی۔ میں ان دونوں حضرات کی طرح بلند آہنگ نہیں ہوتا۔ (تحریک، ستمبر 1956)

● حالی کی اصلاح شاعری کو داغ کی سوقیت کا ردّعمل سمجھا جاتا ہے لیکن مجھے کئی بار یہ گمان گزرتا ہے کہ کم از کم تصوّرِ عشق کے معاملے میں وہ نظریاتی طور پر داغ کا ہم عقیدہ تھا۔ داغ کی سوقیت کا باعث یہی بات تو تھی کہ اس نے عشق کو چوما چاٹی کا مترادف سمجھ لیا تھا۔ کیا جب حالی

اے عشق تو نے اکثر قوموں کو کھا کے چھوڑا

کا نعرہ بلند کرتے ہیں تو ان کا مفہومِ عشق اس سے مختلف ہوتا ہے؟ آخر اقبال کو بیداری کا پیغام

دینے کے لیے عشق کی تذلیل کی کیوں ضرورت محسوس نہیں ہوئی؟ میرے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ اقبال کی نظروں سے ادب کا بنیادی مقصد اوجھل نہیں ہوا اور حالی اصلاح کے جوش میں اپنے حقیقی مقصد کو ہی بھول گئے۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ اقبال کی شاعری ایک زندہ شاعری کی طرح لوگوں کے دل اور زبان پر ہے اور حالی کی شاعری صرف امتحان پاس کرنے کے کام آتی ہے۔
(تحریک، ستمبر 1956)

- ادب بہتر زندگی کی اُمنگ کا مظہر ہے۔ اس اعتبار سے ادیبوں کا غیر مقلّد ہونا قابلِ فہم ہے اور یہ بات بھی قابلِ فہم ہے کہ وہ موجودہ صورتِ حال کے مقابلے میں سماجی تبدیلی کے حامی ہوں۔ جب بے اطمینانی زندگی کی بدصورتی کے خلاف بغاوت کی شکل میں نمودار ہوتی ہے تو یہ مقدّس بن جاتی ہے۔ اس طرح یہ زندگی کی تطہیر کا باعث بنتی ہے اور اس سے زندگی کے مجموعی حسن میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس اُمنگ کو دبانے کا مطلب یہ ہوگا کہ زندگی مہمل بن جائے اور آئندہ ترقی کی راہیں مسدود ہو جائیں۔ لیکن جب کوئی ادیب اپنے خالص ادبی مشاغل کو چھوڑ کر سماجی تبدیلی کی کسی منظّم کوشش میں شرکت کرتا ہے تو اسے راہ کے خطروں سے آگاہ کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں ادیب کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے آدرش داد کو تخریب اور غدّاری کی آلائشوں سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرے۔ (تحریک، فروری 1958)

- جہاں تک بطور امرِ واقعی اردو کے ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ زبان ہونے کا تعلّق ہے، اس سے نہ کبھی انکار ہوا ہے اور نہ آئندہ کبھی ہوگا۔ لیکن جہاں تک اردو کے تحفّظ کا تعلّق ہے، یہ تو ہر حال میں ضروری ہے خواہ یہ مسلمانوں کے بہتر فرقوں میں سے بھی صرف ایک فرقے کی زبان ہو۔ (تحریک، مارچ 1958)

- اس وقت تک ہمارا رویّہ کچھ ایسا رہا ہے جیسے اردو کا مسئلہ چند حکّام رس لوگوں کی ذاتی سفارش سے حل ہو جائے گی اور ایسا کرتے وقت ہم بھول گئے ہیں کہ حکّام رسی کشتۂ مصلحت بنانے کی اہلیت بھی رکھتی ہے۔ آخر یہ بھی تو ممکن ہے کہ لوگ اردو تحریک کے زور پر آگے بڑھیں اور اس کے بعد اردو

کے مطالبات کی تکمیل کی بجائے مفادِ ذاتی ہے کے حصول میں مصروف ہو جائیں۔جن تحریکوں کی پشت پر کوئی متحدہ آواز نہیں ہوتی ان کا حشر اکثر یہی ہوتا ہے لہٰذا اگر اردو کا تحفّظ واقعی مقصود ہے تو اس کی پشت پر متحدہ رائے عامہ ضرور ہونی چاہیے۔اور اس رائے عامّہ کو اتنا فعال ہونا چاہیے کہ وہ تحریک کے لیڈروں کا محاسبہ کرتی رہے۔ (تحریک، مارچ1958)

● انسان کی فکر اور آرزومندی پر کمیونزم جو پابندی لگاتا ہے، اس کا سب سے بنیادی اور اہم پہلو یہ ہے کہ یہ پابندی کوئی اتفاقی چیز نہیں بلکہ ایک منصوبے کا جو پورے غور کے بعد پہلے ہی سے طے کرلیا گیا ہے، لازمی حصّہ ہے جو لوگ انسانی ذہن کو غلامی کی زنجیریں پہنا رہے ہیں ان کے متعلق صرف یہی کہنا کافی نہیں کہ وہ فارمولوں پر ایمان رکھنے کی وجہ سے عالم سرشاری میں ہیں۔ انھیں یہ بھی یقین لاحق ہو گیا ہے کہ ان کے فارمولے سائنسی طریق پر دریافت کیے گئے ہیں۔اور یہ بے خطا ہیں۔اپنے ساتھی انسانوں کے خلاف جن جرائم اور بے رحمیوں کا وہ ارتکاب کرتے ہیں وہ وقتی انقلابی جوش میں سرزد ہونے والی عام زیادتیاں نہیں بلکہ غیر جذباتی فیصلوں کا نتیجہ ہیں اور ان فیصلوں کی پشت پر جبر کے انتہائی مکمل ہتھیار ہیں۔ (تحریک، اپریل1958)

● جمہوریت کا یہ تصوّر بڑا ہی غلط ہے کہ اکثریت کو اپنی من مانی کرنے کا حق حاصل ہے۔ ہندوستان جیسے ملک میں تو یہ تصوّر اور بھی نقصان دہ ہے۔کیونکہ یہاں اکثریتیں اور اقلیتیں مذہب کی بنا پر مستقل حیثیت اختیار کر لیتی ہیں۔ان حالات میں اگر اقلیتوں کو ان کے مخصوص مفاد کے تحفّظ کا اطمینان دلا دیا جائے اور اس معاملے میں عددی اکثریت کے بجائے اقلیت کے جذبات کا احترام ملحوظ رکھا جائے تو جمہوریت کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا بلکہ یہ امر اس کے استحکام کا باعث بنتا ہے۔ (تحریک، اپریل1959)

● وحدت اور یکجہتی میں جو لطیف فرق ہے اسے نظر انداز کرنا جمہوریت اور قوم پرستی دونوں کے لیے نقصان دہ ہے۔یکجہتی صرف بنیادی امور پر اتفاق کا مطالبہ کرتی ہے اور وحدت جذئیات کی حد تک یک رنگی کا۔ یہ یک رنگی جمہوری نظام میں ممکن نہیں لہٰذا ایک سنگی سماج کا مطالبہ کرنے والے

لازمی طور پر آمریّت اور جبر کی راہ پر گامزن ہو جاتے ہیں۔

(تحریک، اپریل1959)

● سماج سے ادیبوں کا مطالبہ صرف اتنا ہونا چاہیے کہ وہ ان کے تخلیقی عمل میں مخل نہ ہو۔ اگر سماج غیر مقلّدوں پر عرصۂ حیات تنگ نہیں کرتا اور اس میں فکر اور تحریر کی آزادی ہے تو ادیبوں کو بطور ادیب اس سماج سے کوئی شکایت نہیں ہونی چاہیے۔ اس سے زیادہ مراعات طلبی غلط ہے اور اپنے فن کو زنجیریں پہنائے بغیر ادیب سماج سے مراعاتِ خصوصی کا مطالبہ نہیں کر سکتے۔ ظاہر ہے کہ مراعاتِ خصوصی سماج مجموعی طور پر تو عطا کرنے سے رہا کیونکہ یہ اتنا پھیلا ہوا ہے کہ اس کے لیے کسی متفقہ فیصلے پر پہنچنا ناممکن ہے لہٰذا مراعات طلبی کا مرکز بالآخر اربابِ اقتدار ہی بن جائیں گے اور اپنے پر داغ کے اس شعر کا اطلاع کیے بغیر۔

خیر نوّاب کی مناتے ہیں
جس کا کھاتے ہیں اس کا گاتے ہیں

ادیب، اربابِ اقتدار سے اس قسم کے مطالبات نہیں کر سکتے۔ (تحریک، مارچ1961)

● زور جمہوریت پر دیا جانا چاہیے، سیکولرازم پر نہیں۔ ایک جمہوری حکومت لازمی طور پر سیکولر ہوگی لیکن سیکولر حکومت کے لیے جمہوری ہونا ضروری نہیں۔ اقلیتوں کی حفاظت جمہوری نظام میں یقینی ہے لیکن ایک ایسے نظامِ حکومت میں جو سیکولر تو ہے لیکن جمہوری نہیں، یہ حفاظت اتنی یقینی نہیں رہتی۔ ہٹلر نے جرمنی میں جو نازی نظام قائم کیا تھا وہ سیکولر تھا لیکن وہ نظام چونکہ جمہوری نہیں تھا اس لیے اس نے صرف یہودی اقلیت کے مدنی حقوق ہی پامال نہیں کیے بلکہ ان کے وجود کا ہی خاتمہ کر دیا۔ اسی طرح روس اور چین میں کمیونسٹوں نے جو نظامِ حکومت قائم کیا وہ سیکولر تو ہے لیکن چونکہ جمہوری نہیں اس لیے اقلیتیں وہاں بھی پامال ہو رہی ہیں۔ (تحریک، جولائی1961)

● فرقہ وارانہ اتحاد کے مسئلے کو جنگِ اقتدار کے مسئلے سے بالکل الگ رکھنا چاہیے اور وطن دوستی کی کسوٹی کسی جماعت سے وفاداری کو نہیں بلکہ ملک سے وفاداری کو سمجھنا چاہیے۔ جب تک کوئی

پارٹی ملک کے مجموعی مفاد سے انحراف نہیں کرتی اس وقت تک اس کو اپنے تمام گروہی مفادوں کی تقویت کے لیے کام کرنے کا حق حاصل ہے کیونکہ جو مفاد ملک کے مجموعی مفاد سے متصادم نہیں ان کی تکمیل کے لیے کوشاں ہونا نہ جمہوریت کے منافی ہے، نہ وطن دوستی کے۔ تجربہ انھیں از خود بتا دے گا کہ ان کے گروہی مفاد کی تکمیل بھی ملک کی بیشتر آبادی کی تائید اور حمایت کی متقاضی ہے اور اس کے بعد جب وہ اتحاد کی طرف قدم بڑھائیں گے تو وہ زیادہ مفید اور زیادہ قابلِ اعتماد ہوگا۔
(تحریک، مارچ 1962)

● آزاد ملکوں کے کچھ دانشور جو کمیونزم کے حقیقی خط و خال کو برداشت کرنے کی تاب نہیں رکھتے، اس میں محیّر العقول تبدیلیوں کے خواب دیکھتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ خواب جادوئی محل کے خواب دیکھنے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے جو آنکھ کھلتے ہی ارڑ دھم کر کے نیچے آ گرتا ہے۔
(تحریک، اپریل 1963)

● دانشور ایک ایسے شخص کو کہتے ہیں جس کی الگ دنیائے خیال ہو، جو اپنے ڈھنگ پر سوچتا ہو اور اپنی کوئی مخصوص رائے رکھتا ہو۔ صرف یہی نہیں کہ اس رائے کا اس کے وقت یا اس کے ملک کی رائے عامہ سے ہم آہنگ ہونا ضروری نہیں بلکہ یہ بھی ضروری نہیں کہ کسی ملک کے تمام دانشور یا کوئی دو دانشور ایک ہی انداز میں سوچیں۔ لہٰذا کسی مسئلے پر دانشوروں کے اجتماعی ردِ عمل کا سوال خارج از بحث ہے۔ (تحریک، دسمبر 1965)

● سیاسی حکمرانوں کو بسا اوقات اس مشکل صورتِ حال کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے کہ وہ رائے عامہ کی مخالفت کے خوف سے مفید پالیسیوں کو پسِ پشت ڈالنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ یہ کام دانشوروں کا ہے کہ وہ رائے عامہ میں اعتدال پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ اس کا وار خود سہیں اور ماحول کو صحیح بات کی پذیرائی کے لیے سازگار بنائیں۔ ایک دانشور کا کردار دراصل شنکر بھگوان کا کردار ہوتا ہے جو زہر خود پی لیتا ہے اور امرت دوسروں کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔
(تحریک، دسمبر 1965)

- اگر دانشورِ حق گوئی کی راہ ترک کر کے جادۂ تقلید کو اپنا لیں تو ان کی گراوٹ کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ بیشتر جابر حکمراں انھیں کے کاندھوں پر سوار ہو کر آگے بڑھے ہیں۔ لینن اور ہٹلر دونوں کو ہی نظامِ جبر کے قیام میں نام نہاد دانشوروں سے مدد ملی ہے اور جب انھوں نے اپنا نظامِ جبر مکمل کر لیا تو یہ طبقہ ان کے کشتگان میں سرِ فہرست تھا۔ (تحریک، دسمبر 1965)

- ہندوستان میں یہ بات مسلّمات میں شامل سمجھی جاتی ہے کہ ملک کی تقسیم کا باعث مسلم لیگ کی قیادت تھی۔ لیکن تقسیم سے پہلے کی سیاسی صورتِ حال کے جو گوشے حال ہی میں بے نقاب ہوئے ہیں ان سے اس مفروضے کی تائید نہیں ہوتی بلکہ تازہ حقائق سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تقسیم کا اصل باعث مذہبی فرقہ پرستی نہیں بلکہ غالی قوم پرستی اور ایک ایسا جامد سیاسی اندازِ نظر تھا جو بے لچک اصول پرستی میں مبتلا ہونے کے باعث کسی بھی مفاہمانہ طرزِ عمل کے لیے تیار نہیں تھا۔ اب یہ بحث کچھ زیادہ اہم نہیں کہ ملک کی تقسیم کو روکنے کے لیے کس وقت ہم کیا کر سکتے تھے لیکن ماضی سے ہم یہ سبق ضرور سیکھ سکتے ہیں کہ سیاست میں جامد اصولوں کی کچھ زیادہ گنجائش نہیں ہوتی۔ عملی سیاست میں زیادہ اہمیت اس بات کی نہیں کہ کیا ہونا چاہیے بلکہ اس بات کی ہے کہ کیا ممکن ہے؟ اب بھی اگر ہم اپنی اس روش میں تھوڑا بہت اعتدال پیدا کر لیں کہ ہر معاملے میں ہماری ہی رائے صائب ہوتی ہے اور ہم سے اختلاف رکھنے والے لازمی طور پر گمراہ بدطینت لوگ ہیں تو ان مسائل کو سلجھانے میں کہیں زیادہ آسانی پیدا ہو سکتی ہے جن کا ان دنوں ہمیں سامنا ہے یا آگے چل کر سامنا ہو سکتا ہے۔
(تحریک، ستمبر 1966)

- آزادانہ انتخاب کو ختم کر کے کمیونسٹ حکمراں اپنی نامقبول حکومت کے تحفظ کا تو سامان پیدا کر لیتے ہیں لیکن اس فریب کو قائم رکھنا ان کے لیے ممکن نہیں کہ ان کی حکومت کی مخالفت کا فقدان ان کے نظامِ حکومت کو تسلیم کر لینے کے مترادف ہے۔ جب لوگوں کو ان کے خلاف انتخاب میں ووٹ دے کر اپنی ناپسندیدگی ظاہر کرنے کا موقع نہیں ملتا تو وہ اس کا اظہار ایک ایسے طریقے سے کرتے ہیں جو کمیونسٹ حکمرانوں کی کچھ زیادہ ہی رسوائی کا باعث بنتا ہے وہ لینن کی اصطلاح میں پرچی کی بجائے ''اپنے پاؤں سے ووٹ ڈالتے ہیں۔'' جب لینن سے لوگوں نے کہا تھا کہ جرمنی کے

ساتھ معاہدۂ صلح کرنے سے پہلے روسی فوجیوں کی رائے معلوم کرلے تو اس نے جواب دیا تھا کہ یہ لوگ صلح کے حق میں ووٹ دے چکے ہیں اور یہ ووٹ انھوں نے میدانِ جنگ سے بھاگ کر ''اپنے پانْو سے دیا ہے'' کمیونسٹ سلطنت کے باسی بھی ووٹ کا یہی طریقہ استعمال کررہے ہیں۔ آئے دن کمیونسٹ سرحدوں پر انتخاب ہوتا رہتا ہے۔ لوگ اپنے بیوی بچّوں اپنے گھروں کو چھوڑ کر آزاد دنیا کی طرف بھاگتے رہتے ہیں اور کئی لوگ تو واقعی اپنی جان کی بازی لگا کر بھاگتے ہیں۔
(تحریک، فروری 1967)

● حصولِ مقاصد کے لیے سب کچھ کر گزرنے کا جواز اور اکثریت کے مفاد کی بارگاہ پر اقلیت کے مفادات کی قربانی کو جائز ٹھہرانا، یہ عصری سیاست کے دو انتہائی خطرناک مفروضے تھے اور ان دونوں کے استرداد کو گاندھی جی کے اساسی تصوّرات میں شمار کیا جاسکتا ہے۔
(تحریک، اکتوبر 1968)

● جیسے ہی اپنی ذات کی اصلاح ہوجائے۔ اصلاح کا عمل شروع ہوجاتا ہے کیونکہ اس کے بعد صرف صفر بڑھانے کا عمل باقی رہ جاتا ہے۔ اگر ایک بھی صالح آدمی نہ ہو تو صفر کس عدد پر لگائی جائے گی اور اگر صفر پر صفر لگائی بھی گئی تو نتیجہ وہی صفر رہے گا۔ (تحریک، اکتوبر 1968)

● قانون اور ضابطے کو خیرباد کہنے والے بالعموم یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ عوام کی اکثریت کی خاموش تمنّاؤں کے نمائندے ہیں۔ بالعموم وہ عوام کے غصّے کو کسی ایسے طبقے کے خلاف اُبھارتے ہیں جو اپنی عددی اقلیت کے باعث بے بس ہو۔ لیکن جب وہ اپنی نراجی تحریک کے باعث برسرِ اقتدار آجاتے ہیں تو ان کے جبر کی زد میں صرف وہی لوگ نہیں آتے جنھیں شروع شروع میں انھوں نے اپنا مخالف قرار دیا تھا بلکہ پورا سماج ہی ان کے جبر کی زد میں آجاتا ہے۔
(تحریک، ستمبر 1969)

● اردو کے تقریباً سبھی نامور شاعروں کے کلام میں ہندوستانیت کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔ اس کے باوجود ہم یہ تسلیم کریں گے کہ ہندوستان کی اردو شاعری کا ماحول کلّیۃً ہندوستانی نہیں، اس

میں نل دمینتی کی بجائے قیس وفرہاد کا زیادہ ذکر ہوتا ہے۔ بھیم اورارجن کی جگہ رستم وسہراب کا زیادہ تذکرہ ہے۔لیکن اس کا باعث وہ نہیں جواردو کے نئے نکتہ چیں بتارہے ہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ جس دور میں اردو شاعری کو فروغ ہوا اس وقت فارسی شاعری ہندوستان میں اتنی ہی مقبول تھی جتنا ان دنوں انگریزی ادب ہے۔ جس طرح نئے لکھنے والے اپنی تحریروں میں آج کل انگریزی الفاظ اورانگریزی ادب کے کرداروں کو بار بار استعمال کرتے ہیں، اسی طرح اس زمانے کے شاعر اپنے فارسی شاعری کے مطالعے سے استفادہ کرتے تھے۔ اب جیسے جیسے فارسی کا ذوق کم ہورہا ہے اردو ادب اور شاعری پر فارسی کا اثر گھٹ رہا ہے اورانگریزی ادب اور شاعری کا اثر بڑھ رہا ہے۔ ایک بات اور بھی عرض کردی جائے کہ یہ صرف اردو کے شاعر ہی نہیں جن کی شاعری میں مشاہدے کے مقابلے میں مطالعے کی کارفرمائی زیادہ نظر آتی ہے، یہ الزام ملٹن پر بھی لگ چکا ہے جس کی شاعری میں ایسے پھولوں اور پرندوں کے نام بار بار آئے ہیں جن کا برطانیہ میں کوئی وجود نہیں اور جن کا استعمال اس کے لاطینی زبان کے مطالعے کا نتیجہ ہے۔ (تحریک، فروری 1971)

● حکومت کا نظام خواہ کچھ ہو، حکامِ ریاست کو عام شہریوں پر بہت زیادہ اقتدار حاصل ہوتا ہے۔ انھیں عام شہریوں کو گرفتار کرنے کا حق حاصل ہے، وہ اسے اس کی جائداد سے محروم کرسکتے ہیں اور یہ اعلان کرسکتے ہیں کہ عام شہریوں کو جو قانونی تحفظات حاصل ہوتے ہیں، یہ شخص آج کے بعد ان سے محروم سمجھا جائے گا۔ اگر انھیں یہ اختیارات من مانے طور پر استعمال کرنے کی اجازت دے دی جائے تو عام شہریوں کا کوئی ٹھکانہ نہ رہے۔ ان اختیارات کے من مانے استعمال کے خلاف جمہوری نظام میں ضمانت یہ ہے کہ عدالتیں عمال حکومت کے اعمال کی نگرانی کرتی ہیں جن کی حیثیت عام شہریوں اور عمالِ حکومت کے درمیان ثالث کی ہوتی ہے۔ جمہوری نظام میں عمال حکومت کو قانون اور ضابطے کا اتنا ہی احترام کرنا پڑتا ہے جتنا حقیر سے حقیر شہری کو۔ اگر عدالتوں کی حیثیت عمالِ حکومت اور شہریوں کے درمیان ثالث کی نہ رہے تو وہ صرف عمالِ حکومت کی وقتی ترنگ کی آلۂ کار بن کر رہ جائیں۔ اور شہریوں کے لیے کوئی گوشۂ اماں نہ رہے۔ کچھ ملکوں میں عدالتوں کی یہ حیثیت واقعی ہوگئی ہے۔ وہاں عام شہریوں کا جو حشر ہوا وہ کافی بھیانک ہے۔

(تحریک، مارچ 1971)

● یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ ہندوؤں کی اکثریت اردو زبان سے عناد رکھتی ہے۔ لیکن یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ اردو کے تحفّظ سے انھیں کوئی خصوصی دلچسپی نہیں۔ کوئی تحریک اس وقت تک کامیاب نہیں ہوتی جب تک اسے پرخلوص اور سرگرم لوگوں کی تائید حاصل نہ ہو۔ یہ خلوص اور ولولہ اردو تحریک کو مسلمان ہی مہیّا کر سکتے ہیں کیونکہ اردو ایک ایسی زبان ہے جو ان کے ذہن و دل کی ترجمانی دوسری زبانوں کے مقابلے میں بہتر طور پر کر سکتی ہے اور یہ ان کی ثقافت کی علامت بھی ہے۔ میں یہ مشورہ نہیں دے رہا کہ مسلمان اردو کے بلاشرکتِ غیرے مالک بن بیٹھیں، روشن خیال غیر مسلم افراد کی تائید حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کرنا چاہیے۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اردو تحریک کے بنیادی اور سرگرم معاون مسلمان ہی ہوں گے۔ یہ دلیل کچھ زیادہ وزنی نہیں کہ اگر مسلمانوں نے اردو کو اپنی زبان مان لیا تو غیر مسلم اردو کے اور بھی مخالف ہو جائیں گے۔ یہ تو ممکن ہے کہ غیر مسلم اپنی زبان کی حیثیت سے اردو کی حمایت نہ کریں لیکن مسلمان اس کا تحفّظ اپنی زبان کی حیثیت سے کرنا چاہیں تو انصاف پسند غیر مسلموں کو اس پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔

● مسلمانوں کا یہ جائز حق ہے کہ وہ حکومت سے اردو کے تحفّظ کا مطالبہ کریں یہ مطالبہ بنیادی حقوق کی بنیاد پر کیا جانا چاہیے، نہ کہ سیکولرزم اور مشترکہ تہذیب کے نام پر۔ اس بات کا امکان ہے کہ حکومت اردو والوں کے جائز حقوق کو مان لے۔ لیکن اگر ایسا نہ ہو تب بھی مسلمان اپنی کوششوں سے اردو کو بچا سکتے ہیں۔ میں یہ باور کرنے سے انکار کرتا ہوں کہ کروڑوں افراد کا ایک فرقہ اپنی زبان کا تحفّظ نہیں کر سکتا بشرطیکہ وہ اس کا مصمّم عزم کر لے۔ (تحریک، فروری 1973)

گوپال متل بحیثیت شاعر

گوپال متّل اعلیٰ درجے کے شاعر تھے۔ وہ منفرد ہی نہیں بلکہ فطری شاعر تھے۔ 1951 کا ایک واقعہ نقل کرتا ہوں، جس سے ان کے فی البدیہہ اشعار کہنے کا بھی پتہ چلتا ہے۔

1951 میں لال قلعہ میں جشنِ جمہوریہ کے سلسلے میں ایک مشاعرہ ہوا تھا جو براہِ راست نشر ہو رہا تھا۔ یہ مشاعرہ اردو سبھا کے زیرِ اہتمام تھا اور منتظمین میں منشی گوپی ناتھ امن لکھنوی بھی تھے۔ شاعروں پر یہ پابندی عائد کی گئی کہ وہ شراب پی کر نہ آئیں۔ جوش صاحب کو یہ ناگوار ہوا۔ وہ نہ صرف شراب پی کر آئے بلکہ شراب اپنے ساتھ بھی لیتے آئے اور مشاعرہ شروع ہو جانے کے بعد اسٹیج کے ایک طرف اپنی الگ محفل آراستہ کر لی۔ اِدھر شعرا کلام سُنا رہے ہیں، اُدھر دورِ جام چل رہا ہے۔ رہی سہی کسر جوش صاحب نے اپنی باری آنے پر امتناعِ شراب کے خلاف رباعیات پڑھ کر پوری کر دی۔

آتے نہیں جن کو اور دھندے ساقی
اوہام کے بنتے ہیں وہ پھندے ساقی
جس مے کو چھڑا سکا نہ اللہ اب تک
اس مے کو چھڑا رہے ہیں بندے ساقی

اے ترکِ شراب کے سیہ قلب وکیل
توجبرِ حکومت کو سمجھتا ہے دلیل
تیری دہشت سے چھوڑ دے گا پینا
انساں کو اس قدر سمجھتا ہے ذلیل

واقف بھی ہیں آپ ؟ زندگی ہے گرداب
آنسو کی طرح غریب پیتے ہیں شراب
جو وقت ہے دراصل ترس کھانے کا
اس وقت بھی اعتراض کرتے ہیں جناب

کہتے ہیں ، دل رہینِ مستی نہ رہے
کمبخت کو جھوٹی تشفی نہ رہے
کھاتا ہوں ، شراب پی کے عشرت کا فریب
یاروں کی تمنّا ہے کہ یہ بھی نہ رہے

یہ حکم نہ بن جائیں فسانے تو سہی
اس ڈانٹ سے اُبھریں نہ ترانے تو سہی
مے خانوں کو اے جیل بنانے والو
جیلیں نہ بنیں شراب خانے تو سہی

آنا تو صُراحیاں گراکر آنا
انگور کی بیل تک جلا کر آنا
مجھ رند کے منہ پہ تھوک دینا جس روز
انساں سے مے کشی چھڑاکر آنا

سامعین ان کے جرأتِ اظہار پر آہ آہ اورفنِ شعرگوئی پر واہ واہ کا فلک شگاف نعرہ بلند کرنے لگے۔ امن صاحب نے بے بسی سے اِدھر اُدھر دیکھا اور جوش صاحب کے بعد بسمل شاہجہانپوری کی ایما پر انھیں شعرخوانی کی دعوت دی۔ بسمل صاحب نے غزل پڑھی، جس میں ایک شعر یہ بھی تھا۔

جو رندِ بدکلام اخلاق کی حد سے گزر جائے
نکلوا دو اسے اردو سبھا کی جلد محفل سے

اس شعر کا سامعین پر منفی اثر ہوا اور دوسرے مصرعے میں جو تعقید لفظی ہے لوگ اسے لے اڑے۔ متّل صاحب نے امن صاحب کی پریشانی اور بے بسی دیکھ کر ان کی حمایت کا فیصلہ کیا اور وہیں بیٹھے بیٹھے کچھ شعر موزوں کیے اور مائک پر آ کھڑے ہوئے۔

وطن میں ہو اگر عیش و مسرّت کی فراوانی
مجھے کیا گر کوئی لطفِ مئے گلفام لیتا ہے
مگر جب قوم کے ہاتھوں میں ہو کاسہ گدائی کا
کوئی خود دار اپنے ہاتھ میں کب جام لیتا ہے
کمربستہ وطن ہو جب پئے تکمیلِ آزادی
وہ بے غیرت ہے جو ساقی کا دامن تھام لیتا ہے
شرابِ ناب کیسی شیرِ مادر ہے حرام اس پر
جو ایسے وقت میں بادہ کشی کا نام لیتا ہے

اتفاق کی بات ہے کہ حاضرین نے متّل صاحب کے شعروں پر بے تحاشہ داد دی اور ہر شعر کو تین تین چار چار بار پڑھوایا گیا۔ گوپال متّل صاحب نے اس نظم کو نہ تو اپنے مجموعۂ کلام میں شامل کیا ہے اور نہ کبھی اس واقعے کا ذکر ہی کرتے ہیں۔

ڈاکٹر حامد اللہ ندوی فرماتے ہیں:

گوپال متّل ایک اچھے شاعر بھی تھے، تحریک کے صفحات میں جہاں ان کی نثر نگاری کے رنگارنگ روپ دکھائی دیتے ہیں وہاں ان کا کلام بھی نظموں، غزلوں اور قطعوں کی شکل میں جگہ

جگہ جلوہ گر نظر آتا ہے۔ ان کا یہ کلام 'دوراہا'، 'صحرا میں اذان' اور 'شرارِ نغمہ' کے نام سے الگ الگ مجموعوں کی شکل میں چھپ چکا ہے۔

متّل صاحب لکھتے ہیں:

''میں تارک الدنیا نہیں ہوں اور زندگی کو اس کے تمام مکروہات کے ساتھ قبول کر چکا ہوں لیکن ان مکروہات کے خلاف احتجاج کی صلاحیت اب بھی مجھ میں باقی ہے، میری حیثیت اس راہی کی ہے جو منزل پر پہنچنے کے بعد بھی یہ سوچتا ہے کہ یہ ساری مسافت میں نے کیوں طے کی؟ میں زندگی کے ہنگاموں میں شرکت ضرور کرتا ہوں لیکن اس شرکت کے باوجود تنہائی کا احساس برقرار رہتا ہے، اس تنہائی کے احساس کو زائل کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ اس دنیا اور اس کے مکروہات سے الگ اپنی کوئی خیالی دنیا بسائی جائے، جدید علوم سے ناآشنا نہیں اور خوب جانتا ہوں کہ یہ فرار ہے، لیکن یہ بھی کیا کم ہے کہ پائے فرار ابھی شل نہیں ہوئے۔ غالب کو تو یوں کہنا پڑ گیا تھا ع

نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے، نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

میری شاعری زندگی سے چرائے ہوئے انہی چند لمحوں کی داستان ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اس واردات میں میں آپ کو بھی شریک کر لوں۔''

گوپال متّل کا زمانہ نظموں کی مقبولیت کا زمانہ تھا، ترقی پسند شعرا صرف نظمیں لکھتے تھے، غزل کو سرمایہ داروں کا ورثہ سمجھتے تھے اور ان نظموں میں ان کے موضوع ہوتے، مزدور، سرمایہ دار، محنت کش، لینن، اسٹالن وغیرہ، یا پھر عورت Sex۔ مگر یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ امیر غریب کا فرق، کمزور اور طاقتور کی کشمکش، ظالم و مظلوم کی لڑائی یہ سب کچھ آج کی بات نہ تھی، یہ سب باتیں اس وقت سے موجود ہیں جب سے دنیا بنی ہے، اور ہر زمانے میں ایسے اصلاح پسند بھی پیدا ہوئے ہیں جو ان ناانصافیوں کے خلاف آواز اٹھاتے رہے ہیں، مگر اشتراکیت پسندوں نے ان مسائل کا سہارا لے کر اشتراکیت کی ایسی تشہیر کی جیسے یہ سارے مسائل سرمایہ دارانہ نظام کے پیدا کردہ ہیں اور ان کا حل صرف اشتراکیت کے معاشی نظام کے سامنے سرِتسلیم خم کر دینے میں ہے۔

گوپال متّل نے بھی نظمیں لکھی ہیں، پابند بھی، آزاد بھی، مگر ان نظموں میں انھوں نے نہ سرمایہ داروں کو بُرا بھلا کہا، نہ مزدور اور محنت کش کو ہیرو بنایا، نا ہی جنس کو ادب کا ایک عنصر قرار دیا بلکہ انھوں نے اپنی ان نظموں کے ذریعے زندگی کے ان تلخ حقائق کی عکاسی کی ہے، جن سے انسان روزِ ازل ہی سے دوچار ہے اور جس کا سہارا لے کر اشترا کی دنیا میں روس کی بالادستی قائم کرنا چاہتے ہیں، ان کی ایک مشہور نظم ہے 'دوراہا' اس میں انھوں نے بڑی خوبی سے امیر غریب کے اس فرق کی تصویرکشی کی ہے۔ اس نظم کے ابتدائی شعر ہیں ؎

اُدھر عیش کی بزم آراستہ ہے اِدھر فرض کا پُرخطر راستہ ہے
اِدھر فاقہ مستوں کی آہ و بکا ہے، رُبابِ مسرّت اُدھر نغمہ زا ہے
اِدھر کامرانی کی دلکش امیدیں، اُدھر دل شکن روح فرسا شکستیں
اِدھر کیف و مستی، اُدھر تلخیِ غم، اِدھر قہقہے، اس طرف چشمِ پرنم
میں اے دل قدم کس طرف کو بڑھاؤں میں یہ راہ پکڑوں کہ اس سمت جاؤں
دوراہے پہ ہے کارواں زندگی کا

وہ ترقی پسندوں کی طرح اپنی نظموں میں انقلاب کا نعرہ نہیں لگاتے، مگر انھیں یہ یقین ہے کہ ظالم و مظلوم کی صف آرائی جلد ہی ختم ہونے والی ہے۔ چنانچہ وہ اپنی ایک اور نظم 'یور ہائی نس' میں آنے والے حالات کی اس طرح پیشین گوئی کرتے ہیں ؎

کہاں بے کیف فریادیں کہاں عشرت کی شہنائی
عجب کیا ہے نہ حاصل ہو اگر ان کو پذیرائی
جہاں آٹھوں پہر عیش و طرب کے زمزمے گونجیں
وہاں محکوم کے احوالِ غم کی کیوں ہوشنوائی
جنھیں جرأت ہو بزمِ عیش میں فریاد کرنے کی
سیاست کا تقاضا ہے سمجھنا ان کو سودائی
جو اس پر معترض ہوتے ہیں، باغی بھی ہیں سرکش بھی
مناسب ہے کہ سَر ان کا کچل دے شانِ دارائی

یہ سب سچ تھا مگر اب طور ہی دیگر ہیں دنیا کے
زمانہ لے رہا ہے اِن دنوں اِک تازہ انگڑائی
منظّم ہورہی ہیں کشتگانِ جور کی فوجیں
بس اب ہونے کو ہے مظلوم و ظالم میں صف آرائی
ہوا کرتا ہے عبرت ناک ان کا انتقام اکثر
عطا ہوتی ہے مظلوموں کو جب تاب و توانائی
حقوقِ زندگی کا جب اسے احساس ہوتا ہے
ملادیتی ہے مٹّی میں رعایا شانِ دارائی

گوپال متّل کی ایک دونہیں ایسی بیسیوں نظمیں ہیں جن میں انھوں نے بڑی خوبی سے زندگی کے ان تلخ حقائق کی عکّاسی کی ہے مگر ترقی پسندوں کی طرح اس کو اشتراکیت کی تشہیر کا ذریعہ نہیں بنایا۔

گوپال متّل کو اپنا وطن عزیز تھا، اپنے وطن کے لوگ عزیز تھے، اپنے وطن کا ذرّہ ذرّہ عزیز تھا، انھوں نے اپنے وطن میں بیٹھ کر روس اور چین کی تعریف نہیں کی، نہ لینن و اسٹالن کی عظمت کے گیت گائے، اگر کسی کو خراجِ عقیدت پیش بھی کیا تو وہ صرف اپنے وطن کی بڑی ہستیوں کو، چنانچہ ان کے کلّیات میں ہمیں صرف تین ہستیوں پر نظمیں ملتی ہیں، گاندھی جی پر، حالی پر اور ایم.این.رائے پر۔ ان تینوں نظموں میں انھوں نے اپنی جذبات نگاری کو انتہائے عروج تک پہنچا دیا ہے، میں بہ طور نمونہ ایم.این.رائے پر لکھی ہوئی نظم کو یہاں پیش کرنا چاہتا ہوں جو ان کے خلوصِ جذبات کا ایک خوبصورت نمونہ ہے، نظم ہے۔

مہر سے تابناک تر ذرّہ
دیوتا سے بلند تر انساں
ہر ادا اس کی کفر کا انداز
لیکن اس پر بھی صاحبِ ایماں

جانے کتنا جمیل تھا وہ نقش
جو بہ ہر رنگ ناتمام رہا
انتہا اس کے ظرف کی مت پوچھ
خمُ لنڈھا کر جو تشنہ کام رہا

جانے کن منزلوں میں لے پہنچا
ذوقِ تکمیلِ جستجو اس کو
لے اڑی کن بلندیوں کی طرف
اس کی پروازِ آرزو اس کو

ساز ہر چند ٹُوٹ جاتا ہے
نغمۂ شوق مَر نہیں سکتا
موت کا سرد ظالم ہاتھ
اس کو خاموش کر نہیں سکتا

اس کی مانوس ناصبور نگاہ
قلب کو اب بھی گدگداتی ہے
ایسا محسوس ہورہا ہے مجھے
اس کی آواز اب بھی آتی ہے

اپنی ان نظموں میں وہ ہندو بن کر سامنے آتے ہیں نہ مسلمان، ان کے پورے کلّیات میں لے دے کے 'بدری ناتھ' کے عنوان سے چار مصرعوں کی ایک چھوٹی اور ہلکی پھلکی نظم ہے جس کو اگر آپ چاہیں تو ان کے ثقافتی رشتے کی علامت سمجھیں، یا آپ چاہیں تو قدرت کے ایک صاف ستھرے، حسین اور بلند و بالا نظارے سے تعبیر کریں، کہتے ہیں

بڑی پوتر ہے ہندوستان کی دھرتی
اور اس میں سب سے زیادہ پوتر بدری ناتھ
گناہ گار نظر اٹھ سکے اُدھر ، توبہ
کہ ہے طہارتِ فطرت کا چتر بدری ناتھ

تقسیمِ ہند کے بعد جو خونیں فسادات ہوئے اس سے ان کے دل کو بہت بڑا دھکّا لگا، ان کی بسی بسائی دنیا اجڑ گئی اس کو بھی وہ ہندو مسلم نقطۂ نظر سے نہیں دیکھتے بلکہ الٹا شرمندہ ہیں کہ یہ سب انہی کا کیا دھرا ہے، نظم کا عنوان ہے 'فسادات پر ایک نظم' اس کے صرف چار مصرعے ہیں، کہتے ہیں۔

سارے ہنگامۂ بیداد میں اپنا حصّہ
ایک احساسِ ندامت کے سوا کچھ بھی نہیں
میرے دامن پہ نہیں خون کا دھبّہ لیکن
اپنی ہی ذات پہ قاتل کا گماں ہوتا ہے

زبان و بیان کے معاملہ میں گوپال متّل کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنی نظموں میں موقع محل کی مناسبت سے ہندی کے آسان، دلکش اور خوبصورت الفاظ کا استعمال کر کے اپنے اشعار کو دوبالا کر دیتے ہیں، ان کی ایک نظم ہے، 'انیائے' اس کے چند بند سنیے ان کی تاثیر دیکھیے اور ان کی زبان کی شیرینی کا لطف اٹھایئے۔

علم جھکے زر کی چوکھٹ پر اپنا مان گھٹائے
عاقل کرے اس کی چاکری جاہل حکم چلائے
کتنا گھور انیائے
تجھ بن یہ انیائے ایشور، کس سے دیکھا جائے
سندر لڑکی جسم کو بیچے اور کرم بن جائے

بیچے اپنی روح کو پنڈت اور گیانی کہلائے
کتنا گھورانیائے
تجھ بن یہ انیائے ایشور کس سے دیکھا جائے
شاعر جس کا اوجِ تخیل عرش کو بھی شرمائے
شان میں جاہل راجا کی دن رات قصیدے گائے
کتنا گھورانیائے
تجھ بن یہ انیائے ایشور، کس سے دیکھا جائے

گوپال متّل نے کبھی مذہبی نقطۂ نظر سے نہ سوچا تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ خدا کے قائل نہ تھے، مذہب کے قائل نہ تھے، دین دھرم کے قائل نہ تھے بلکہ الٹا وہ ہر مذہب ہر دھرم کا احترام کرتے تھے، خاص طور پر سکھ دھرم کی تعلیمات تو لڑکپن ہی سے ان کے دل پر نقش تھیں، چنانچہ کلّیاتِ گوپال متّل کے آخر میں 'سچّے بول' کے نام سے کچھ گرو بانیاں ہیں جن کی گوپال متّل نے منظوم شرح لکھی ہے، ہر بانی کی شرح اس کے معنوں کی وسعت اور گہرائی کے حساب سے کہیں چھے شعروں میں ہے، کہیں آٹھ شعروں میں اور کہیں اس سے بھی زیادہ اشعار میں ہے۔ ان کی ابتدا میں گوپال متّل کا لکھا ہوا ایک الگ دیباچہ ہے جس میں انھوں نے صراحت کی ہے کہ:

> ''غالباً سن 1936 کی بات ہے، میں ان دنوں دسویں کا طالب علم تھا، ایک سکھ مہنت ہمارے گھر آیا کرتے تھے جو سکھ مت کے بارے میں ہمیں اچھی اچھی باتیں بتاتے تھے، ان کی باتوں میں دلچسپی بڑھی تو میں اس گوردوارے میں بھی جانے لگا جس کے وہ مہنت تھے، گوردوارہ میری جنم بھومی مالیر کوٹلے سے چند میل کے فاصلے پر ہی تھا، چھٹّی کے دن میں صبح ان کے پاس چلا جاتا اور شام کو واپس آ جاتا۔
>
> مجھے وہ گوروؤں کی بانی بھی سناتے تھے اور بات چیت میں سکھ روایت سے تعلق رکھنے والی کچھ کہاوتیں بھی آ جاتی تھیں، ان میں جو باتیں مجھے پسند آتیں میں انھیں لکھ لیتا۔

1939 میں بی.اے میں داخلہ لینے کے لیے لاہور چلا گیا امتحان دے کر لَوٹا تو وہ کاغذات نظر پڑے جن پر میں مہنت صاحب کی بتائی ہوئی باتیں لکھتا رہا تھا، نتیجہ نکلنے سے پہلے فرصت ہی فرصت تھی، ان میں بعض کی بنا پر میں نے نظمیں لکھ دیں۔

اب تک ان نظموں کو میں خود ہی پڑھ کر لطف اندوز ہوتا رہا ہوں، آج اس لطف میں آپ کو بھی شریک کر رہا ہوں۔''

اس تمہید کے بعد انھوں نے وہ بانیاں اور کہاوتیں اور ان کے نیچے ان کے آدھار پر لکھی ہوئی ان کی اپنی وہ نظمیں دی ہیں جو سرتاسَر اخلاقی تعلیم پر مبنی ہیں، ایسی اخلاقی تعلیم جو تقریباً سبھی مذاہب دیتے رہے ہیں، ہر نظم پر الگ سے روشنی ڈالنا ممکن نہیں اس لیے میں ایک بانی اور اس پر مبنی گوپال متّل کی نظم نقل کرتا ہوں، اس سے ان کی اس سلسلے کی اور نظموں کا بھی اندازہ ہو جائے گا۔

چِت بولیاں تت پایئے سو بولیے پروان
پھکا بول و گُچھنا ، سن مورکھ انجان

ہر حال میں پرہیز کر اس عادتِ بد سے
ہر عیب سے ہے عیب بُرا تلخیِ گفتار
یہ چیز بنا دیتی ہے احباب کو دُشمن
حق میں ہے محبت کے یہ چلتی ہوئی تلوار
اپنا ہو کہ بیگانہ ہو ، دُشمن ہو کہ ہو دوست
ہوجائے گی تلخی سے تری بات کی بیزار
گنبد ہی کی مانند ہے یہ بزمِ جہاں بھی
ہوتی ہے یہاں اپنے ہی الفاظ کی تکرار

جو کچھ بھی کہے گا اسے سننا ہی پڑے گا
اس بات کو کر دل سے فراموش نہ زنہار
لازم ہے ان الفاظ کے کہنے سے بھی پرہیز
سننے سے جن الفاظ کے آتی ہو تجھے عار
ہوتی ہے اسی چیز سے تسخیر دِلوں کی
اے دوست بڑی چیز ہے شیرینیِ گفتار

وارداتِ دل کو اشعار میں ڈھال کر انھیں خوبصورت اور موثر انداز میں پیش کرنے کا دوسرا نام غزل ہے، اس کا پہلا زینہ محبت ہے، جو دو دلوں کے ملنے سے پیدا ہوتی ہے، ابتدا میں یہ ذاتی اور شخصی ہوتی ہے مگر جیسے جیسے اس کی گرمی سے دل جلتا، نرم ہوتا اور پھیلنے لگتا ہے، ویسے ویسے وہ ساری دنیا کو اپنے اندر سمیٹ لینے کی کوشش کرتا ہے، اب اس کو دوسروں کے غم اپنے غم اور دوسروں کے دکھ اپنے دکھ معلوم پڑتے ہیں۔

گوپال متّل ایک آزادہ رو انسان تھے، انھوں نے اچھے اور بُرے دونوں دن دیکھے ہیں، انھوں نے عشق کیا، دکھ اٹھایا، غم جھیلے، یہاں تک کہ اپنے سامنے دوسروں کو تڑپتے دیکھا، قتل ہوتے دیکھا اور ان سارے حالات سے گزرے جن میں غالب جیسا شاعر بھی شدّتِ غم سے پکار اٹھا تھا؎

دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

ایسے میں گوپال متّل کیا کرتے، وہ بھی روئے، تڑپے اور اپنی تڑپ کو غزل کے پیمانوں میں ڈھال کر، انھیں ہمارے لیے محفوظ کر دیا۔

جس طرح زمانے کے ساتھ ساتھ سماجی قدریں بدلتی رہتی ہیں اسی طرح وقت کے ساتھ ساتھ محبت کی قدریں بھی بدلتی رہتی ہیں، ایک وقت تھا جب شاعر کہتا تھا؎

راز و نیازِ عاشقی بھول کے بھی نہ فاش کر
وہ بھی اگر ہوں سامنے آنکھ اٹھا کے بھی نہ دیکھ

لیکن جب سے مغربی ثقافت کے اثرات عام ہوئے ہیں، گھٹ گھٹ کر مرنے کو محبت نہیں سمجھا جاتا، اب یا تو آپ کھلّم کھلاّ محبوب کو اپنی بانہوں میں سمیٹنے کی بات کیجیے، یا سحاب قزلباش کی طرح اشاروں کنایوں میں کہہ دیجیے کہ ع

اس وقت اُجالا ہوتا ہے جب شمع بجھائی جاتی ہے

گوپال متّل نے دونوں زمانے دیکھے ہیں، ان قدروں کی تبدیلی کا بھی انھیں پتہ ہے، مگر ان کی وضع داری نے انھیں وقت کے ساتھ بدل جانے کی اجازت نہیں دی، اسی لیے انھوں نے نہ پرانی قدروں کو پوری طرح خیر باد کہا، نہ نئی قدروں کو پوری طرح گلے لگایا بلکہ ان کی کوشش ہمیشہ یہ رہی کہ پرانی اور نئی دونوں قدروں کو ساتھ لے کر چلیں۔ اسی لیے ان کی غزلوں میں ہمیں یک رنگی کے بجائے کئی رنگوں کا خوبصورت امتزاج ملتا ہے، کہیں وہ غالب کے روپ میں سامنے آتے ہیں، تو کہیں داغ کے، کہیں حسرت موہانی کا رنگ ان پر غالب ہے تو کہیں فیض کا۔ پہلے آپ انھیں غالب کے رنگ میں دیکھیے، فرماتے ہیں ؎

پھر وہ نظر ہے اذنِ تماشا لیے ہوئے
تجدیدِ آرزو کا تقاضا لیے ہوئے
چشمِ سیہ میں مستیاں شامِ وصال کی
عارض فروغِ صبحِ نظارا لیے ہوئے
ہر ایک شخص ترکِ تمنّا کا مدّعی
ہر ایک شخص تیری تمنّا لیے ہوئے
کل شب طلوعِ ماہ کا منظر عجیب تھا
تم جیسے آ گئے رخِ زیبا لیے ہوئے

اور اب داغ کے رنگ میں کہا ہے ؎

دلِ آگاہ کیا دیا تو نے
آفتوں میں پھنسا دیا تو نے

مرحبا ! اے تصوّرِ رخِ یار
دل مرا جگمگا دیا تو نے
مفلسی اور عاشقانہ مزاج
دینے والے یہ کیا دیا تو نے
میری سوئی ہوئی امنگوں کو
آج کیوں گدگدا دیا تو نے

کہیں وہ حسرت کے رنگ میں نظر آتے ہیں مگر ذرا فرق کے ساتھ، فرمایا ہے ؎

رنگینیِ ہوس کا وفا نام رکھ دیا
خود داریِ وفا کا جفا نام رکھ دیا
بے مہریِ حبیب کا مشکل تھا اعتراف
یاروں نے اس کا نازو ادا نام رکھ دیا
فطرت میں آدمی کی ہے مبہم سا ایک خوف
اس خوف کا کسی نے خدا نام رکھ دیا
مفلس کو اہلِ زر نے بھی کیا کیا دیے فریب
اپنی جفا کا حکمِ خدا نام رکھ دیا

ذرا فیض کا رنگ بھی دیکھ لیجیے، کہتے ہیں ؎

خزاں چمن سے مرے بار بار گزری ہے
مگر ہلاکِ فسونِ بہار گزری ہے
وہ عمر ناصحو! اتنی بھی رائیگاں تو نہ تھی
جو زیرِ سایۂ گیسوے یار گزری ہے
نگاہِ لطف میں آمیزشِ کرم اے دوست
مزاجِ اہلِ محبت پہ بار گزری ہے

سکوں ہے گھر میں، مگر اس کی لذتیں مت پوچھ
وہ زندگی ، جو سرِ رہ گزار گزری ہے

ان اشعار میں گوپال متّل نئے پرانے شاعروں کے رنگ میں نظر تو آتے ہیں مگر آہنگ ان کا اپنا ہے اور جہاں رنگ وآہنگ دونوں ان کے اپنے ہیں وہاں ان کی غزلوں کی فضا ہی بدل گئی ہے، قدم قدم پر ایک تازگی ہے، ایک حسن ہے، ایک دلکشی ہے، ایسی ایک آدھ غزل آپ بھی سن لیجیے، فرماتے ہیں ؎

فقط اِک شغلِ بیکاری ہے اب بادہ کشی اپنی
وہ محفل اٹھ گئی قائم تھی جس سے سرخوشی اپنی
خدایا ناخدا اب جس کو چاہو بخش دو عزّت
حقیقت میں تو کشتی اتفاقاً بچ گئی اپنی
بس اب گزریں گے راہِ زندگی سے بے نیازانہ
اگر تیرے کرم پر منحصر ہے زندگی اپنی
بہت جی چاہتا ہے یہ فقط نقصِ بصارت ہو
بڑی سُرعت سے دنیا کھورہی ہے دلکشی اپنی
خموشی پر بھی ہے ان کو گماں عرضِ تمنّا کا
زبانِ حال سے کچھ کہہ گئی وارفتگی اپنی

گوپال متّل کی ایک چھوٹی سی غزل اور سن لیجیے، کہا ہے ؎

پڑا جو ترکِ محبت میں مسکرا دینا
پھر اس کے بعد نہ لب پر کبھی ہنسی آئی
دل و دماغ میں موجِ سرُور دوڑ گئی
پھر آج یاد تری وقتِ مے کشی آئی
پڑے جہاں بھی قدم رہ گزر چمک اٹھّی
ترے خرام سے ذروں میں روشنی آئی

گوپال متّل کی نظموں اور غزلوں کو پڑھنے کے بعد ان کی داخلی شخصیت (Inner Personality) کا جو خاکہ ذہن میں اُبھرتا ہے وہ ایک ایسے شاعر کا خاکہ ہے جو بہ ظاہر پُرسکون ہے مگر دل میں ہلچل مچی ہوئی ہے، وہ صرف اپنا غم نہیں دوسروں کے غم کو بھی اپنا ہی غم سمجھتا ہے اور اپنے جذبات واحساسات کو اپنی شاعری میں اس طرح پیش کرتا ہے کہ ہر شخص کو وہ اپنی ہی داستان معلوم دیتی ہے، گوپال متّل نے خود بھی اپنی ایک نظم 'میری شاعری' میں اپنی شاعری کے بارے میں حسبِ ذیل رائے ظاہر کی ہے ۔

نہ دے دادِ سخن مجھ کو نہ کر اے دوست شرمندہ
کچھ ایسے فخر کے قابل نہیں تخئیلِ تابندہ
میں اپنے نطق کے اعجاز سے آگاہ ہوں خود بھی
میں اپنے فکر کی پرواز سے آگاہ ہوں خود بھی
پھڑک جاتا ہے میرے شعر پر ہر نوجواں کا دل
دھڑکتا ہے مرے ہر لفظ میں ہندوستاں کا دل
مرے افکار کی جدّت دِلوں پر حشر ڈھاتی ہے
مجھے صورت گری جذباتِ دل کی خوب آتی ہے
مری تحریر کا ہر لفظ تصویرِ معانی ہے
میں نازاں ہوں کہ ہر اِک شعر میرا جاودانی ہے

انتخاب نثر و نظم

(نثر)

ماہنامہ 'تحریک' کی فائلوں میں سے صرف تین مضامین دیے
جا رہے ہیں تا کہ متّل صاحب کی نثر کی خوبیوں کو اُجاگر کیا جا سکے۔
اختصار اور جامعیت ان کا وصفِ خاص ہے۔ ان کی نثر کا ایک اہم
وصف منطقی استدلال بھی ہے۔

ادب میں ہندوستانیت کا فقدان حقیقت یا واہمہ؟

اردو کے کچھ ادیبوں نے جن کے نام ادب کی دنیا میں کچھ زیادہ معتبر نہیں، ادب کی منصوبہ بندی کا کام اپنے ذمّے لے لیا ہے۔ اردو ادب میں انھیں خامیاں ہی خامیاں نظر آتی ہیں اور اس کی اور اردو زبان کی بقا کا انھیں ایک ہی طریقہ نظر آتا ہے کہ اسے ایک منصوبہ بند انداز میں قومیایا جائے۔

اردو ادب میں خامیاں حالی کو بھی نظر آئی تھیں لیکن انھوں نے صرف ان کی نشاندہی پر اکتفا نہیں کی تھی بلکہ جیسی تبدیلیاں ادب میں وہ چاہتے تھے ان کے مطابق اپنی تحریروں کو تبدیل بھی کر لیا۔ سوال یہ نہیں کہ حالی جو تبدیلیاں ادب میں لانا چاہتے تھے وہ سودمند اور مستحسن تھیں یا

نہیں، اہم بات یہ ہے کہ اصلاح کی ابتدا انھوں نے اپنی ذات سے کی اور صرف یہی نہیں کیا کہ لیڈر بن کر دوسرے ادیبوں کو مشورہ دیتے رہیں۔ اردو ادب کی اصلاح کا منصوبہ بنانے والے نئے لوگ ایسا نہیں کر رہے، خواہ عدم صلاحیت کی بنا پر خواہ کسی اور باعث سے۔

انھیں شکایت ہے کہ اردو ادب کا نفسیاتی ماحول ہندوستانی نہیں لیکن وہ ایسا ادب پیدا کرنے کی کوئی کوشش نہیں کر رہے جس میں وہ مخصوص قسم کی ہندوستانیت جلوہ نما ہو جس کی عدم موجودگی کے وہ اتنے شاکی ہیں۔ ان کا سارا زورِ قلم اس قسم کی صحافتی تحریروں پر صرف ہو رہا ہے جو یا تو طعن و تشنیع پر ختم ہوتی ہیں یا ہمدردانہ مشوروں پر۔

یہ مشورے اور یہ طعن و تشنیع اگر صرف اپنی گرم بازاری کے لیے ہیں تو ہمیں اس پر کوئی خاص اعتراض نہیں۔ لوگ اپنے آپ کو نمایاں کرنے کے لیے کیا کچھ نہیں کر گزرتے۔ ایک عورت کے متعلق تو یہاں تک مشہور ہے کہ اس نے اپنی انگوٹھی کی طرف اپنے پڑوسیوں کی توجہ مبذول کرانے کے لیے اپنے گھر کو آگ لگا دی تھی۔ لیکن اگر یہ مشورے نیک نیتی سے دیے جا رہے ہیں اور انھیں عملی جامہ پہنانے سے وہ صرف اپنی عدم صلاحیت کی بنا پر قاصر ہیں تو ہم ان کی خدمت میں عرض کریں گے کہ اپنے مشوروں کی بوچھاڑ کرتے وقت پہلے وہ موجودہ اردو ادب اور اس کی گزشتہ تاریخ کا تھوڑا بہت مطالعہ ضرور کر لیں۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو اردو کے ادیبوں اور شاعروں کے خلاف انھیں جو شکایتیں ہیں، ان میں سے اکثر بے جا نظر آئیں گی۔ اس کے علاوہ انھیں اس ذہنی بیماری سے بھی نجات حاصل کرنی چاہیے جس میں مبتلا ہو کر آدمی اپنی ناکامی کے اسباب اپنی ذات میں تلاش کرنے کی بجائے اسے دوسروں کی سازش کا نتیجہ قرار دینے لگتا ہے۔

پہلے ہم دوسری بات کو لیں گے اور ذرا کھل کر بات کریں گے۔ اردو والوں (بلکہ کیوں نہ صاف بیانی سے کام لے کر کہا جائے مسلمانوں) کے خلاف انھیں شکایت ہے کہ وہ ہندو ادیبوں کی کتابیں شائع نہیں کرتے بلکہ مسلمان کتب فروش انھیں اپنی دکان پر فروخت کے لیے رکھنے کو بھی تیار نہیں ہوتے۔ کچھ ہندو ادیبوں کی یہ شکایت بالکل بجا ہوگی۔ لیکن اس میں کسی سازش یا فرقہ پرستی کا پہلو ڈھونڈنا غلط ہے۔ کیونکہ یہی ناشر اور کتب فروش بہت سے مسلمان ادیبوں کی کتابیں شائع اور فروخت کرنے سے بھی اسی سنگدلی سے انکار کر دیتے ہیں۔ دراصل ناشر وہی کتاب

چھاپے گا اور کتب فروش اسی کتاب کو اپنی دکان پر رکھے گا جس کے فروخت ہونے کا امکان نظر آئے۔ اگر ناشر اور کتب فروش آپ کی تصانیف کی طرف راغب نہیں ہو رہے ہیں تو اس کا ایک ہی علاج ہے کہ آپ اپنی تحریر کے معیار کو اونچا کریں ورنہ آپ کی کتابیں چھاپ کر اردو کے ناشر دیوالیہ تو ہو سکتے ہیں، آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔

اب رہی پہلی بات، یعنی اردو ادب میں ہندوستانیت کے فقدان کی شکایت۔ اس سلسلے میں بھی ہم کھل کر بات کریں گے۔ نظیر اکبرآبادی کے علاوہ بھی جس کی شاعری کا ماحول صرف ہندوستانی ہی نہیں بلکہ ہندوانہ ہے، اردو کے تقریباً سبھی نامور شاعروں کے کلام میں ہندوستانیت کی نشاندہی کی جا سکتی ہے۔ اس کے باوجود ہم یہ تسلیم کریں گے کہ ہندوستان کی اردو شاعری کا ماحول کلیۃً ہندوستانی نہیں اس میں نل دمینتی کی بجائے قیس و فرہاد کا زیادہ ذکر ہوتا ہے۔ بھیم اور ارجن کی جگہ رستم و سہراب کا زیادہ تذکرہ ہے۔ لیکن اس کا باعث وہ نہیں جو اردو کے نئے نکتہ چیں بتا رہے ہیں۔ اردو ادب پر اسلامیت کی چھاپ ہوتی تو وہ اثرات جن کے ہمارے نئے ناقد شاکی ہیں عربی زبان کے ذریعے آتے۔ لیکن اردو ادب جس زبان کے ادب سے واقعی متاثر ہے وہ عربی نہیں فارسی ہے اور جن کے ناموں کے بار بار ذکر سے ہمارے ناقد برہم ہوتے ہیں، ان میں سے بیشتر طلوعِ اسلام سے پہلے کے دور سے تعلّق رکھتے ہیں۔ نہ وہ شعائرِ اسلامی کے نمائندے تھے اور نہ اسلام کی تاریخ سے ان کا کوئی تعلق ہے۔ اردو ادب پر تو اسلامیت کی چھاپ کیا ہوگی یہ چھاپ تو خود ایرانی ادب پر نہیں جس کے بیشتر اردو شاعر خوشہ چیں رہے ہیں۔

بات صرف اتنی ہے کہ جس دور میں اردو شاعری کو فروغ ہوا اس وقت فارسی شاعری ہندوستان میں اتنی ہی مقبول تھی جتنا ان دنوں انگریزی ادب ہے۔ جس طرح نئے لکھنے والے اپنی تحریروں میں آج کل انگریزی الفاظ اور انگریزی ادب کے کرداروں کو بار بار استعمال کرتے ہیں، اسی طرح اس زمانے کے شاعر اپنے فارسی شاعری کے مطالعے سے استفادہ کرتے تھے۔ اب جیسے جیسے فارسی کا ذوق کم ہو رہا ہے اردو ادب اور شاعری پر فارسی کا اثر گھٹ رہا ہے، اور انگریزی ادب اور شاعری کا اثر بڑھ رہا ہے۔ ایک بات اور بھی عرض کر دی جائے کہ یہ صرف اردو کے شاعر ہی نہیں جن کی شاعری میں مشاہدے کے مقابلے میں مطالعے کی کارفرمائی زیادہ نظر آتی ہے۔ یہ

الزام ملٹن پر بھی لگ چکا ہے جس کی شاعری میں ایسے پھولوں اور پرندوں کے نام بار بار آئے ہیں جن کا برطانیہ میں کوئی وجود نہیں اور جن کا استعمال ملٹن کے لاطینی زبان کے مطالعے کا نتیجہ ہے۔

ہم اس بات کے خلاف ہرگز نہیں کہ اردو زبان کو زیادہ رنگارنگ ہونا چاہیے اور یہ بھی ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ہندوستان کی دوسری زبانوں کے ساتھ ساتھ اس پر بھی دوسری زبانوں کے اثرات کو اتنا حاوی نہیں ہونا چاہیے کہ وہ ہندوستانیت پر غالب آ جائیں لیکن اگر آپ اردو ادب کا اور ہندوستان کی دوسری زبانوں کے ادب کا واقعی مطالعہ کرتے رہے ہیں تو یہ گوشہ آپ کی نگاہوں سے مخفی نہیں ہوگا کہ جو مشورے آپ اردو کے ادیبوں اور شاعروں کو دے رہے ہیں اسی قسم کے مشورے دوسری زبانوں کے لکھنے والوں کو بھی دیے جا رہے ہیں اور سبھی لکھنے والے ان دانشوروں کی پذیرائی کے لیے تیار نہیں۔ یہ بھی صحیح نہیں کہ اردو شعر و ادب میں مقامیت نمایاں نہیں ہو رہی۔ ہندوستان ہی نہیں بلکہ پاکستان کے شعر و ادب میں بھی ایسے تصورات آ رہے ہیں جو خالص دیومالائی ہیں اور جن کا اسلامیات سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اور ہاں آپ کا جو نظریہ ہے، اس کے بہترین ترجمان بھی آپ نہیں بلکہ ایک پاکستانی مسلمان ہے ہماری مراد وزیر آغا سے ہے اور میرا جی سے جس نے اردو زبان میں ایسی شاعری کی جس پر ہندی شاعروں کو بھی رشک آئے اس کا نام ثناء اللہ تھا۔ بات صرف اتنی ہے کہ تخلیقی عمل کسی منصوبے کے تحت تکمیل نہیں پاتا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آپ اردو ادب کے متعلق منصوبے تو تیار کرتے ہیں لیکن ان کا تخلیقی اظہار آپ کے بس میں نہیں۔

(فروری 1971)

ادب میں فحاشی پر احتساب

ادب میں فحاشی پر احتساب کا مسئلہ سنجیدہ غور و فکر کا متقاضی ہے۔ چونکہ اس سلسلے میں مروّجہ قانون میں ترمیم کرنے کا ایک بل بھی پارلیمنٹ میں پیش ہونے والا ہے اس لیے اس مسئلے کے تمام پہلوؤں پر غور کیا جانا چاہیے۔

پہلی بات یہ ہے کہ اس امر کی صریح وضاحت ممکن نہیں کہ کیا چیز فحش ہے اور کیا نہیں؟ بالعموم ایسے ہر فن پارے کو فحش قرار دے دیا جاتا ہے جس کے متعلق فیصلہ کرنے والے مجسٹریٹ کو

یہ گمان گزرے کہ اسے پڑھنے سے قاری کے اخلاق پر برا اثر پڑسکتا ہے۔ یہ ثابت کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی کہ زیرِ احتساب تحریر کو پڑھ کر کسی کا اخلاق واقعی خراب ہوا ہے۔ گویا سزا ارتکابِ جرم پر نہیں بلکہ احتمالِ جرم پر دی جاتی ہے۔ اس طرح یہ انسدادی نظر بندی کے قانون کے مترادف ہے جسے بالعموم ہنگامی حالات ہی میں قابلِ جواز سمجھا جاتا ہے۔

فحاشی کے متعلق کسی مستقل رائے عامہ کا بھی وجود نہیں جیسا کہ متعدد ہندو مندروں کے نقش و نگار دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا ہے، قدیم ہندو معاشرے میں جنسی افعال کی نقاشی کو فحش قرار دے کر قابلِ احتساب کبھی نہیں سمجھا گیا۔ قدیم سنسکرت تصانیف مثلاً کمار سمبھو، گیتا گووند اور اس قسم کی کئی اور کتابوں میں بھی عملیات وصل کو بڑی بے تکلفی سے بیان کیا گیا ہے۔ نہ کبھی ان کتابوں کو قابلِ مواخذہ سمجھا گیا اور نہ ان کے مطالعے پر ہی کوئی روک لگائی گئی۔

اسلامی معاشرے میں فنونِ لطیفہ کو کسی خاص احترام کا مستحق نہیں سمجھا گیا لیکن مخربِ اخلاق ہونے کے الزام میں ان پر احتساب بھی نہیں کیا گیا۔ اگر ایسا کیا جاتا تو اس کی زد میں مولانا رومی کی مثنوی ضرور آتی۔ فارسی کی دوسری کتابوں مثلاً گلستاں وغیرہ کو بھی اس ذیل میں لانا مشکل نہیں۔ لیکن یہ وہ کتابیں ہیں جنھیں معلّم اخلاق ہی سمجھا جاتا ہے اور بچّے بچیوں تک کو ان کے مطالعے کی عام اجازت رہی ہے۔ اردو کے قدیم شاعروں کے فرمودات میں بھی فحاشی کی مثالیں تلاش کرنا دشوار نہیں۔ میر اور ذوق تک کے کلام میں انھیں بہ آسانی تلاش کیا جاسکتا ہے۔ پنجابی میں وارث شاہ کی ہیر کو تاریخی اہمیت کا مستحق سمجھا جاتا ہے لیکن اگر عملیات وصل کے بیان کو فحاشی قرار دے دیا جائے تو یہ کتاب فحاشی کی پوٹ ہے۔

اگر فحش ادب پڑھ کر لوگوں کا اخلاق بگڑتا تو پرانے لوگوں کا اخلاق موجودہ دور کے لوگوں سے زیادہ خراب ہونا چاہیے تھا لیکن انسدادِ فحاشی کے حامیوں کا کہنا ہے کہ موجودہ نسل کا اخلاق پرانی نسلوں کے اخلاق سے خراب تر ہے۔ ہماری بحث اس دعوے کی صحت یا عدم صحت سے نہیں بلکہ اس فکری تضاد سے ہے جس میں ادب پر احتساب کے حامی بالعموم مبتلا ہوتے ہیں۔

اگر ہر اس چیز کو فحش قرار دے دیا جائے جس سے انسان کے سفلی جذبات کی انگیخت ہوتی تو اس میں صرف ادب نہیں بلکہ بہت کچھ آجاتا ہے۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ عورتوں کا چست

لباس دیکھ کر ان کے جذبات مشتعل ہو جاتے ہیں کچھ اس سے بھی آگے جاتے ہیں۔ ان کے لیے بے پردہ عورت کو دیکھنا ہی سفلی جذبات کی انگیخت کا باعث ہو سکتا ہے۔ اگر ان لوگوں کے اخلاق کے تحفظ کے لیے تمام عورتوں کو پردے میں بٹھا دیا جائے تو بھی مشکل حل نہیں ہوگی۔ کیونکہ ان کے جذبات تو خوبرو لڑکوں کو دیکھ کر بھی مشتعل ہو سکتے ہیں۔

سب سے بڑی قباحت یہ ہے کہ اگر احتساب کا سلسلہ چل نکلے تو یہ کہیں ختم نہیں ہوتا۔ چین میں بیتھوون کی موسیقی اور شیکسپیئر تک کو مخرب اخلاق قرار دیا جا چکا ہے۔ روس میں سیناوِسکی اور ڈینیل کو جیل بھیجتے وقت ان پر مخربِ اخلاق ہونے کا الزام لگایا گیا تھا۔ ہندوستان میں جب منٹو کا کمیونسٹ ادیبوں سے بگاڑ ہوا تو ترقی اور انقلاب کے ان حامیوں نے اس پر فحاشی ہی کا الزام چسپاں کیا تھا اور نئے ادیبوں کے خلاف بھی وہ اسی الزام کو دہرا رہے ہیں۔

ہندوستان میں فحش نگاری کے خلاف پہلا قانون ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے میں بنا تھا اور ظاہر ہے کہ اس میں اس وقت کی مصلحتوں کو بھی کچھ دخل تھا۔ کچھ ترمیموں کے ساتھ یہ قانون بنیادی طور پر آج تک موجود ہے اور سزا دیتے وقت بالعموم برطانوی عدالت کے پرانے فیصلوں کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ یہ بات البتہ فراموش کر دی جاتی ہے کہ اب برطانیہ اور دوسرے یورپی ملکوں میں ماحول بہت کچھ بدل گیا ہے۔ کبھی وہاں ''لیڈی چڑلی کا عاشق'' کو قابلِ ضبطی سمجھا جاتا تھا لیکن آج ایسا نہیں۔ فحش ادب پر پابندی لگانے کے خلاف سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اس سے اس ادب کی کشش بڑھ جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ جب سویڈن میں فحش ادب پر سے پابندی ہٹالی گئی تو وہاں فحش ادب کی فروخت بتدریج بالکل ہی ختم ہوگئی۔

ہندوستان میں ایک دشواری یہ بھی ہے کہ ہمارا سماج مختلف ثقافتی گروپوں پر مشتمل ہے۔ آخر کسی تحریر کو فحش قرار دینے کے لیے کس ثقافتی گروپ کی رائے کو فیصلہ کن قرار دیا جائے گا؟ قبائلی بھی تو ہمارے ہی ملک میں آباد ہیں جن میں سے کچھ عورتیں انگیا کا استعمال ضروری نہیں سمجھتیں اور بعض کے یہاں ازالۂ بکارت کا جشن منایا جاتا ہے۔

پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ ہم جدید فحش تحریروں پر تو پابندی لگائیں لیکن قدیم فحش تحریروں کو مواخذے سے بری قرار دیتے رہیں؟ ہمارے قانون کی ایک اہم دفعہ یہ ہے کہ

ریاست، مذہب، نسل، ذات جنس اور مقام پیدائش کی بنا پر شہریوں میں کوئی امتیاز روا نہیں رکھے گی۔ کیا یہ بات مختلف گروپوں کے درمیان امتیاز کا باعث نہیں ہوگی کہ ہم فحاشی کے ان مظاہر پر تو کوئی روک نہ لگائیں جو نقش و نگار کی صورت میں مندروں پر موجود ہیں لیکن ایسی نئی ادبی تحریروں کو قابلِ مواخذہ سمجھیں جن پر فحاشی کا گمان گزر سکتا ہے۔ (مارچ 1968)

مثنوی فریادِ داغ

اردو کے مشہور ناقد سر عبدالقادر مرحوم نے مثنوی 'فریادِ داغ' کے متعلق کہا ہے کہ:

''اگرچہ داغ نے چار ضخیم دیوان چھوڑے ہیں مگر صرف یہ مثنوی ہی ان کی بقائے دوام کے لیے کافی ہے۔''

ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کو اگرچہ شکایت ہے کہ: ''بعض جگہ تعیّش اور خراب جذبات کی تصویریں متانت اور تہذیب سے گری ہوئی ہیں۔'' لیکن انھیں یہ بھی تسلیم ہے کہ: ''اس مثنوی کے بہت سے اشعار اعلیٰ درجے کے ہیں اور سادگی، روانی اور عمدگی ان کی قابلِ داد ہے۔''

'فریادِ داغ' داغ کے اپنے وارداتِ قلبی کا بیان ہے۔ یہ ان کی اپنی حیاتِ معاشقہ ہے۔ اس حیاتِ معاشقہ کے متعلق ان کا اپنا بیان یہ ہے کہ ''مجھے تمام عمر میں پانچ عشق ہوئے جن میں دو اب تک میرے رگ و ریشہ میں سمائے ہوئے ہیں۔ ایک مُنی بائی حجاب کا دوسرا عشق خواجہ معین الدین چشتیؒ کا۔'' 'فریادِ داغ' مُنی بائی حجاب کے عشق کا بیان ہے کہ جو کلکتہ کی ایک مشہور طوائف تھی اور جس سے ان کی ملاقات قیام رامپور کے دوران میں بے نظیر کے میلے میں ہوئی۔ لیکن صرف یہی بات کہ داغ نے اس عشق کا ذکر خواجہ معین الدین چشتیؒ کے عشق کے ساتھ کیا ہے اس کا ثبوت ہے کہ انھیں اس پر کوئی ندامت نہیں تھی بلکہ ناز تھا۔ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کو تعیش کی جو تصویریں نظر آئیں وہ غالباً اس تصور کا نتیجہ ہیں کہ شاعر کا عشق لازمی طور پر افلاطونی ہوتا ہے۔

داغ افلاطونی عشق کے قائل نہیں تھے جسم کے تقاضوں پر انھیں کوئی ندامت نہیں تھی اور

وہ عشق کو تفریح کا ذریعہ بھی سمجھتے تھے لیکن عشق کو تفریح کا ذریعہ اور جسم کا تقاضا سمجھنے کے باوجود ان کا تصوّرِ عشق اخلاص و صداقت سے محروم نہیں تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو عشق کے یہ مثبت پہلو ان کے ذہن میں نہیں آ سکتے تھے:

سب نے کی ہیں برائیاں اس کی
میں نے لکھیں بھلائیاں اس کی
دل بنا ہے اسی مزے کے لیے
میں نے یہ لطف جان دے کے لیے
شیوۂ خاص ہے یہ عام نہیں
جو نکمّے ہیں ان کا کام نہیں
عشق سے دل گداز ہوتا ہے
ناز میں بھی نیاز ہوتا ہے
عشق سے آدمیّت آتی ہے
آدمی کو مروّت آتی ہے
عشق باطن ہو عشق ظاہر ہو
اس سے توبہ کرے تو کافر ہو

جو عشق اس قسم کے جذبات پیدا کر سکے اس کی صداقت سے صرف اس بنا پر انکار نہیں کیا جا سکتا کہ موضوعِ عشق ایک طوائف ہے کیونکہ اہم بات بقول نیاز فتح پوری یہ نہیں کہ "عشق کس سے کیا جائے بلکہ یہ ہے کہ عشق کیسے کیا جائے۔" اور پھر غالب بھی تو کہہ گئے ہیں ع

مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

'فریادِ داغ' کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ شاعر نے اپنے یا اپنے محبوب کے چہرے پر کوئی مصنوعی نقاب نہیں ڈالی مثلاً اپنے متعلق اس نے صاف طور پر بتا دیا ہے کہ یہ اس کا پہلا اور ناگہانی عشق نہیں تھا اور وہ تجربہ کار عاشق تھا۔ عشق کی ابتدا کے باب میں کہتے ہیں ؎

دل ستایا ہوا ہزاروں کا
داغ کھایا ہوا ہزاروں کا
خوب تکلیفِ عشق پائے ہوئے
بیوفاؤں کا رنج اٹھائے ہوئے

لیکن اتنا ضرور ہے کہ جب اس نئی آفتِ جان سے سامنا ہوا تو شاعر عشق و عاشقی سے ہاتھ اٹھا چکا تھا۔

توبہ کر لی پیام سے میں نے
ہاتھ اٹھایا سلام سے میں نے
اس پیام و سلام سے نفرت
تھی محبت کے نام سے نفرت
گو طبیعت تو گدگداتی تھی
پر کسی سے نہ میل کھاتی تھی

اور یہ کوئی عجیب بات نہیں تھی کیونکہ جب داغ کو یہ حادثہ پیش آیا تو ان کی عمر باون سال کی تھی اور انھیں اعصابی امراض نے بھی گھیر رکھا تھا۔

داغ کو یہ بھی احساس تھا کہ ان کی شکل میں ایسی کوئی کشش نہیں جو ان کے محبوب کو ان کی طرف راغب کر سکے۔ عاشق کی تصویر سے معشوق کی مخاطبت کے باب میں وہ حجاب سے اپنے متعلق کہلواتے ہیں۔

ایسی صورت پہ یہ دماغ ترا
خوب رکھّا ہے نام داغ ترا
حسن ہوتا ہے حاصلِ تصویر
روسیہ تو ہے قابلِ تصویر؟
ایسی تصویر کس کو بھاتی ہے
پر بلا سے ہنسی تو آتی ہے

تجھ سے رونق نہیں ہے گھر کے لیے
رکھ لیا ہے نظر گزر کے لیے

لیکن اس سب کچھ کے باوجود داغ کو اپنی طبیعت پر ناز تھا اور ان کا خیال تھا کہ ان کی شاعری آڑے آ جائے گی۔ اس بارے میں محبوبہ سے کہلواتے ہیں ؎

نہ کہیں گے کہ صورت اچھی ہے
ہاں مگر کچھ طبیعت اچھی ہے

پھر داغ کو یہ بھی احساس تھا کہ جس آفتِ جان سے انھیں پالا پڑا ہے وہ کوئی سادہ دل عورت نہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ کائیاں اور معاملہ فہم ہے۔ صید نہیں بلکہ صیّاد۔ معشوقہ کی تعریف میں کہتے ہیں ؎

سج دھج آفت غضب تراش خراش
کسی اچھے کی دل ہی دل میں تلاش
کبھی سائے سے اپنے ڈر جانا
کبھی کچھ بانکپن بھی کرجانا
ہر کسی کو نظر میں رکھ لینا
خوب کھوٹا کھرا پرکھ لینا
نرم باتیں کبھی نزاکت سے
گرم فقرے کبھی شرارت سے
مفت دل لے کے نذرِ جاں لینا
باتوں باتوں میں امتحاں لینا
سادگی میں بناوٹیں کیا کیا
اُکھڑی اُکھڑی لگاوٹیں کیا کیا
ہر کسی سے اِک التفات کی بات
لطف کا لطف اور بات کی بات

سوداگر ہیں کسی سے کام نہیں
پر کوئی شاکیِ کلام نہیں

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس تمام پُرکاری کے باوجود داغ کی کوئی ادا اسے ضرور بھا گئی تھی لہٰذا اس کے لیے انھیں یہ یقین دلانا ضروری ہو گیا۔

ہم کو کچھ آرزوئے مال نہیں
اس کا واللہ کچھ خیال نہیں
زر سے معمور ہے ہمارا شہر
کون سا دوسرا ہے ایسا شہر
ہم تو بھوکے ہیں آدمیّت کے
آدمیّت کے ساتھ الفت کے
ایسے ویسوں سے جی نہیں ملتا
داغ سا آدمی نہیں ملتا

یہ باتیں کتنے ہی رسمی اور پیشہ وارانہ انداز میں کہی گئی ہوں لیکن داغ کو ان پر اعتبار تھا۔ اور بقول میر تقی میر ع

یاں وہی ہے جو اعتبار کیا

اگست 1961

❁❁

نظمیں

(1)

اب کڑی دھوپ کا شکوہ کیسا
اب گلہ کیا ہے مقدر میں اگر
سایۂ گیسوے دلدار تو کیا
کسی دیوار کا سایہ بھی نہیں

دلِ ناکام میسر تجھ کو
صرف دیوار کا سایہ ہی نہیں
سایۂ گیسوے دلدار بھی تھا
تو نے اک منزلِ موہم کی دھن میں ناداں!
وہ سکوں زارِ وفا چھوڑ دیا
اپنا پیمانِ وفا توڑ دیا
تیری آوارگیِ شوق تجھے

ایک ویرانہ تجرید میں لے آئی ہے
جس جگہ ریگِ عقائد کے سوا کچھ بھی نہیں
آہ یہ سعیِ سفر کا انجام!

(2)

مجھے کیا بتاتے ہو
میں جانتا ہوں
وہ ناآشنائے رہِ آشنائی
بڑا سنگدل ہے
ہمیشہ ہی دل کو دکھاتا رہتا ہے

مجھے کیا بتاتے ہو
میں جانتا ہوں
وہ کوچہ
جسے آج تک کوئے دلدار کا نام دیتے رہے
آج شہرِ عدو ہے

مجھے کیا بتاتے ہو
میں جانتا ہوں
قبیلوں میں جب جنگ چھڑتی ہے دل ٹوٹ جاتے ہیں اکثر

(ستمبر 1965)

(3)

یہ دل اب خراب ہے
ایسا خرابہ
کہ برگِ مسرت تو کیا اس میں خارِالم تک نہیں ہے
نہ جشنِ بہاراں
نہ ماتم خزاں کا
یہ دل اب خرابہ ہے لیکن ہمیشہ خرابہ نہیں تھا
کھلے تھے یہاں پھول بھی آرزو کے
چبھے تھے یہاں خار بھی جستجو کے
یہ دل اب خرابہ ہے لیکن سدا بے نیازِ بہار وخزاں تو نہیں تھا
میں وہ عاشقِ رنگ و بو ہوں کہ جس نے
لہو اپنا صرفِ بہاراں کیا تھا

(4)

یوں اچانک ملاقات تجھ سے ہوئی
جیسے رہگیر کو
بے طلب
بے دعا
راہ میں ایک انمول موتی ملے
اور ہنگامِ رخصت یہ احساس ہے
جیسے مردِ جفاکش کا اندوختہ
حاصلِ محنتِ زندگی

راہزن چھین لیں
جیسے زاہد کو پیری میں احساس ہو
عمر بھر کی ریاضت اکارت گئی

(5)

اے دلِ خود دار یہ اچھا کیا
وہ جو اِک لمحہ مسرت کا نصیبوں سے ملا تھا اس کو بھی ٹھکرا دیا
وہ مسرّت کیا جو بن سکتی نہ ہو تیری کنیز
عشق ہے روزِ ازل سے حکمرانِ بحر و بر
عشق اور لمحاتِ عشرت کا غلام
جو ہوا مٹھی میں آ سکتی نہ ہو
اس ہوا میں سانس لینا بھی حرام

(6)

حقیر و ناتواں تنکا
ہوا کے دوش پر پراں
سمجھتا تھا کہ بحر و بر پہ میری حکمرانی ہے
مگر جھونکا ہوا کا ایک البیلا
تلوّن کیش
بے پروا
جب اس کے جی میں آئے رخ پلٹ جائے
ہوا آخر ہوا ہے کب کسی کا ساتھ دیتی ہے
ہوا تو بے وفا ہے کب کسی کا ساتھ دیتی ہے

ہوا پلٹی
بلندی کا فسوں ٹوٹا
حقیر و ناتواں تنکا
پڑا ہے خاکِ پستی پر
خدا جانے کوئی رہگیر بے پروا
جب اپنے پاؤں سے اس کو مسلتا ہے
تو اپنا خوابِ عظمت یاد کر کے اس کے دل پر کیا گزرتی ہے

(7)

یہ جی چاہتا ہے
کہ کچھ کر دکھائیں
کوئی نظم لکھیں
کوئی گیت گائیں
جو یہ بھی نہ ہو تو اسے یاد کر کے
کسی کنج میں بیٹھ کر غم کے آنسو بہائیں

(8)

سلام ہو تری گلیوں پہ اے وطن کہ جہاں
یہ رسم عام ہے ، جو چاہے سر اٹھا کے چلے
کوئی بھی شرط بجز وضع احتیاط نہیں
کوئی سنبھل کے چلے ، کوئی لڑکھڑا کے چلے

سلام ہو تری گلیوں پہ اے وطن ، کہ جہاں
مرے جنون کی پاداش سنگ و خشت نہیں
جہاں پہ دانۂ گندم نہیں ہے وجہِ عتاب
زہے نصیب میسّر ہے وہ بہشتِ بریں!

سلام ہو تری گلیوں پہ ، جو کشادہ رہیں
ہمیشہ میرے لیے قلبِ دوستاں کی طرح
میں ایک سرکش و آوارہ تھا مگر تونے
ہمیشہ بخش دیا ہے شفیق ماں کی طرح

سلام تیری ہوا کو ، تری فضا کو سلام
ہے جن کی دین مرا ذوقِ شعر و نغمہ گری
خلوصِ دل سے دعا ہے ، رہے قیامت تک
مسرّتوں کے ستاروں سے تیری مانگ بھری

وہ بدنصیب جو ہیں خوگرِ نظام جفا
مرے بھی فرقِ انا کو جھکانے آئے ہیں
وہ شب گزیدہ جنھیں روشنی کی تاب نہیں
وہ میرے گھر کی بھی شمعیں بجھانے آئے ہیں

میں اپنے عزم کی سوگند کھاکے کہتا ہوں
ہر ایک نغمۂ دل کو رجز میں ڈھالوں گا
جو تو شفیق ہے میں بھی غیور بیٹا ہوں
قلم کی نوک کو نوکِ سناں بنالوں گا

ہر کجا ہستند

گرچہ ساغر بہ دست ہوں امشب
کیف و مستی سے دل ہے بیگانہ
جیسے بے کیف ہو شراب مری!
جیسے ویراں ہو بزمِ میخانہ
دوست! تیرے بغیر بادہ کشی
عیشِ رفتہ کا ایک جرمانہ
ہوگئے گردشِ زمانہ سے
گرچہ اِک دوسرے سے بے گانہ
پھر بھی تیری ہی یاد آتی ہے
میں اٹھاتا ہوں جب بھی پیمانہ
کوئی درد آشنا نہیں تجھ بن
میں کہوں کس سے دل کا افسانہ
کوئی اہلِ جنوں نہیں ملتا
جس کو دیکھو وہی ہے فرزانہ
مے بھی جس کا علاج کر نہ سکے
ذہنیت اس قدر مریضانہ
غائبانہ کلام ہے تجھ سے
یوں بھی ممکن ہے دل کا بہلانا

یاد اب تک وہ قہقہے ہیں ترے
گونج اٹھتا تھا جن سے مے خانہ
سچ بتا ہیبتِ اذاں سے کیا
دب گیا ہے وہ شور مستانہ
دل پہ رندوں کے کیا گزرتی ہے
بند جب سے ہوا ہے مے خانہ
اس خنک رات میں بجز بادہ
کیسے ممکن ہے دل کا گرمانا
آ کہ اک بار پھر سجائیں ہم!
وہی دیرینہ بزمِ رندانہ!
ظلمتِ مذہب و سیاست میں
پھر سے روشن ہو شمعِ مے خانہ
میں اِدھر چھیڑتا ہوں اپنی غزل
تو اُدھر اپنی دُھن میں لہرانا
محتسب کی نگاہ سے بچ کر!
مے کہیں سے بھی ہو چرالانا
اور اس کوچۂ ملامت میں
آج ممکن ہو گر تو ہو آنا!
چوم لینا وہ کاکل و رخسار
آج تک دل ہے جن کا دیوانہ
میری مجبوریوں کو دیکھ ، کہ اب
میری فطرت نہیں رقیبانہ

شب تاب

یہ برستا ہوا موسم یہ شبِ تیرہ و تار
کسی مدّھم سے ستارے کی ضیا بھی تو نہیں
اُف یہ ویرانیِ ماحول ، یہ ویرانیِ دل

آسمانوں سے کبھی نور بھی برسا ہوگا
برقِ الہام بھی لہرا گئی ہوگی شاید
لیکن اب دیدۂ حسرت سے سُو عرش نہ دیکھ
اب وہاں ایک اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں

دیکھ اس فرش کو جو ظلمتِ شب کے باوصف
روشنی سے ابھی محروم نہیں ہے شاید
اک نہ اک ذرّہ یہاں اب بھی دمکتا ہوگا
کوئی جگنو کسی گوشے میں چمکتا ہوگا
یہ زمیں نور سے محروم نہیں ہوسکتی

کسی جانباز کے ماتھے پہ شہادت کا جلال
کسی مجبور کے سینے میں بغاوت کی ترنگ
کسی دوشیزہ کے ہونٹوں پہ تبسّم کی لکیر
قلبِ عشّاق میں محبوب سے ملنے کی اُمنگ

دلِ زہاد میں ناکردہ گناہوں کی خلش
دل میں اک فاحشہ کے پہلی محبت کا خیال

کہیں احساس کا شعلہ ہی فروزاں ہوگا
کہیں افکار کی قندیل ہی روشن ہوگی
کوئی جگنو کوئی ذرّہ تو دمکتا ہوگا
یہ زمیں نور سے محروم نہیں ہوسکتی
یہ زمیں نور سے محروم نہیں ہوسکتی

گاندھی

ایسی کچھ زندگیاں ہیں جنھیں ملتا ہے ثبات
یہ جہاں یوں تو جہانِ گزراں ہوتا ہے
جو ستارہ بھی چمکتا ہے سرِ عرشِ خیال
چند لمحوں کے لیے نور فشاں ہوتا ہے
حسن آشوب جہاں ہے مگر اس کے باوصف
کچھ ہی مدت کے لیے آفتِ جاں ہوتا ہے
میں نہیں محرمِ اسرارِ مشیت لیکن
بسا اوقات مرے دل کو گماں ہوتا ہے
تو نے از خود ہی اسے چھین لیا تھا بڑھ کر
ملک الموت پہ جو لمحہ گراں ہوتا ہے
''آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری''
آج اس مصرعے کا مفہوم عیاں ہوتا ہے
آسماں حیرتیِ عظمتِ انساں بن کر
اوج سے جانبِ پستی نگراں ہوتا ہے
سوچتا ہے کہ میں اب منبعِ الہام نہیں
چشمۂ فیض تو دھرتی سے رواں ہوتا ہے
کیا ٹھکانے سے لگی ہے تری کشتیِ حیات
تجھ کو معلوم تھا جو مصرفِ جاں ہوتا ہے

غزلیں

(1)

اپنے انجام سے ڈرتا ہوں میں
دل دھڑکتا ہے کہ سچّا ہوں میں

میرا ساقی ہے بڑا دریا دل
پھر بھی پیاسا ہوں کہ صحرا ہوں میں

اور کس کو ہو مرے زہر کی تاب
اپنے ہی آپ کو ڈستا ہوں میں

کیوں کروں پیروِ گوتم و قیس
جب بھرے گھر میں بھی تنہا ہوں میں

تھا وہ کچھ ہم سے زیادہ ہی مریض!
جس کا دعویٰ تھا مسیحا ہوں میں

کیا نہیں ہے کوئی مے ہوش گداز
جتنی پیتا ہوں سنبھلتا ہوں میں

(2)

مصرف کے بغیر جل رہا ہوں
میں سُونے مکان کا دِیا ہوں

منزل ہے نہ کوئی جادہ پھر بھی
آشوبِ سفر میں مبتلا ہوں

محمل بھی نہیں کوئی نظر میں
صحرا کی بھی خاک چھانتا ہوں

منصور، نہ دعوائے اناالحق
سُولی پہ مگر لٹک رہا ہوں

اے اہلِ کرم نہیں میں سائل
رستے پہ یونہی کھڑا ہوا ہوں

اب شکوۂ سنگ و خشت کیسا
جب تیری گلی میں آ گیا ہوں

اِس شہر میں وضعِ کجا کلاہی
میں واقعی درخورِ سزا ہوں

مشکل نہیں ترکِ عشق لیکن
اس کا بھی مآل جانتا ہوں

(3)

سوانگ اب ترکِ محبت کارچایا جائے
اس کے پندار کو آئینہ دکھایا جائے

وضعداریِ محبّت کے منافی ہے تو ہو
آج کالر پہ نیا پھول سجایا جائے

شعر میں تذکرۂ دشت و بیاباں ہو مگر
اک بڑے شہر میں گھر اپنا بسایا جائے

بالکونی وہ کئی دن سے ہے ویراں یارو
اس گلی میں کوئی ہنگامہ اٹھایا جائے

سر یہ کہتا ہے گوارا نہیں اب بارشِ سنگ
دل یہ کہتا ہے اسی کوچے میں جایا جائے

ہم ہی پیچھے رہیں کیوں دعویِٔ جانبازی میں
کیا ضرورت ہے کہ مرکر بھی دکھایا جائے

شاعری میں نہ رہا جذبہ و احساس کو دخل
اب اسے قوم کی خدمت پہ لگایا جائے

(4)

پی ہے اگر شراب تو کچھ لطف اٹھایئے
کیوں اتنی احتیاط ذرا لڑکھڑایئے

لینے نہ دے گی چین محبت کی تیز آنچ
چھینٹوں سے اس کو آج ہوس کے بجھایئے

وہ باوفا نہیں ، نہ سہی ، خوش ادا تو ہے
گر کچھ نہیں تو حظِّ نظر ہی اٹھایئے

واعظ بیانِ خلد بہت خوب ہے ، مگر
اک روز اس کی بزم میں بھی ہو کے آیئے

(5)

فقط اک شغل بیکاری ہے اب بادہ کشی اپنی
وہ محفل اٹھ گئی قائم تھی جس سے سرخوشی اپنی

خدا ، یا ناخدا اب جس کو چاہو بخش دو عزّت
حقیقت میں تو کشتی اتفاقاً بچ گئی اپنی

بہت جی چاہتا ہے یہ فقط نقصِ بصارت ہو
بڑی سُرعت سے دنیا کھورہی ہے دلکشی اپنی

اگر تم ہنس دیے احوالِ دل پر ، کیا تعجب ہے
کہ میں خود بھی بمشکل ضبط کرتا ہوں ہنسی اپنی

ہوئی ہیں بارشیں سنگِ ملامت کی بہت لیکن
زہے وضعِ جنوں قائم ہے شوریدہ سری اپنی

(6)

کس کو ہے حسنِ خدا داد کا دعویٰ دیکھیں
کس کا چہرہ نہیں منّت کشِ غازہ دیکھیں

دل یہ کہتا ہے کہ حسن اس کا جہاں تاب بھی ہو
اور پھر یہ بھی کہ ہم ہی اسے تنہا دیکھیں

وہ جو ہے اونچی حویلی وہاں پھینکیں پتھر
وحشتِ دل کا ہو شاید یہی چارہ دیکھیں

آؤ کچھ جشنِ شہادت ہی میں شرکت ہوجائے
اپنی کھڑکی ہی سے مقتل کا نظارہ دیکھیں

کون منجدھار میں جائے سرِ ساحل بیٹھیں
دور سے ڈوبنے والوں کا تماشا دیکھیں

(7)

دل جلانے سے کہاں دور اندھیرا ہوگا
رات یہ وہ ہے کہ مشکل سے سویرا ہوگا

کیوں نہ اب وضع جنوں ترک کریں ، لوٹ چلیں
اس سے آگے جو ہے جنگل وہ گھنیرا ہوگا

راہِ پُر پیچ کو سہل اتنا بتانے والا
راہبر ہو نہیں سکتا ہے ، لٹیرا ہوگا

وہ بھی انسان ہے اے دل اسے الزام نہ دے
جانے اس کو بھی کن آفات نے گھیرا ہوگا

(8)

فضول تھا گلۂ جورِ آسماں پیارے
زمین بھی تو نہیں گوشۂ اماں پیارے

ترا گلہ ہے نہ کچھ شکوۂ جہاں پیارے
ہمیں نے عمر گنوادی ہے رائیگاں پیارے

کچھ اتنا سہل نہ تھا جادۂ جنوں اے دوست
ترا خیال رہا دل کا پاسباں پیارے

خوا گواہ ! نہیں فکرِ دوری منزل!
تھا آج تک تو مجھے پاسِ ہمرہاں پیارے

قدیم سے مری طرزِ فغاں تو طعن نہ کر
وہی زمیں ہے وہی دورِ آسماں پیارے

گوپال متّل صاحب کے کچھ معاصرین

متّل صاحب نے 'لاہور کا جو ذکر کیا' میں اپنے معاصرین ادیبوں اور صحافیوں کی صحبتوں کا ذکر کیا ہے جو چائے خانوں میں منعقد ہوتی تھیں۔ بیشتر معاصرین کا ذکر کئی جگہ آیا ہے، جو ٹکڑوں میں لکھے گئے ہیں۔ ان سب ٹکڑوں کو جوڑ کر ایک لڑی میں پرو دیا ہے کہ مضمون کی شکل بن جائے۔ ان سے اس دور کے ادبی حالات کا بھی پتہ چل جاتا ہے۔

مولانا تاجور نجیب آبادی

'شاہکار' میں میری تنخواہ صرف تیس روپے تھی لیکن دفتر میں میرے لیے باقاعدہ حاضری ضروری نہیں تھی۔ میری ذمّے داری صرف اتنی تھی کہ پرچہ مرتب کر کے اسے بروقت شائع کر دوں۔ 'شاہکار' کے بیشتر مضمون نگار ایسے تھے جن کی تحریروں پر نظر ثانی کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ خانہ پُری کے لیے ہر وقت ابومحمد امام الدین رام نگری کے مضمون موجود رہتے تھے جو آٹھ آنے فی صفحہ کے حساب سے چھپتے تھے۔ ابومحمد امام الدین کے علاوہ آسی رام نگری کے مضامین بھی انہی شرائط پر چھپتے تھے۔ ان دونوں حضرات کے بھیجے ہوئے بیشتر مضامین ہندی جرائد سے ترجمہ شدہ ہوتے تھے۔ ان کی طرف سے یہ اجازت بھی تھی کہ یہ مضامین کسی بھی نام سے شائع کیے جا سکتے

ہیں۔ اگر کسی ماہ مضامین کی قلّت ہوتی تو ان حضرات کے متعدد مضامین مختلف ناموں سے شائع کر دیے جاتے۔ جن ناموں سے مضامین چھپتے وہ زیادہ تر فرضی ہوتے۔ لیکن کئی بار ایسا بھی ہوا کہ مولانا تاجور نے کسی کو نوازنا چاہا تو مضمون اس کے نام پر شائع کر دیا۔ ادارتی نوٹ مختصرات کے عنوان سے مولانا خود لکھا کرتے تھے لیکن مجھے ہدایت تھی کہ اگر بروقت یہ مجھے نہ ملیں تو میں خود ہی لکھ دیا کروں۔

مجھے ملازم رکھتے وقت مولانا نے یہ وعدہ بھی فرمایا تھا کہ تنخواہ کے علاوہ مجھے منافع میں بھی 25 فیصد کا شریک سمجھا جائے گا لیکن جتنے دن میں وہاں رہا، مولانا کے بیان کے مطابق پرچے میں خسارہ ہی ہوتا رہا۔ جہاں تک میرا تعلّق ہے میں نے نہ تو ان کے وعدے پر کبھی سنجیدگی سے بھروسہ ہی کیا اور نہ کبھی انھیں اس کی یاد دہانی کرائی۔

تنخواہ کی کمی کے مسئلے کا حل بھی جلد ہی نکل آیا۔ 'شاہکار' کے دفتر کے نزدیک ہی ایک مکان پر 'جگت لکشمی' کا سائن بورڈ نظر آیا۔ یہ ایک ہفت روزہ فلمی جریدہ تھا جسے کرن دیوان، جو آگے چل کر فلمی ہیرو بنے اور اب چھوٹے موٹے رول ادا کرتے ہیں، نکال رہے تھے۔ کرن دیوان سے ملاقات ہوئی تو پتہ چلا کہ انھیں کسی ایسے آدمی کی ضرورت ہے جو ان کے اخبار کے لیے ایڈیٹوریل وغیرہ لکھ دیا کرے۔ میں نے تیس روپے ماہوار پر یہ ذمّے داری قبول کر لی۔

'جگت لکشمی' باقاعدہ نہیں نکلتا تھا اور کرن دیوان اکثر مالی مشکلات میں مبتلا رہتے تھے، مجھے تنخواہ بھی باقاعدگی سے نہیں ملتی تھی اور اوسطاً بیس پچیس روپے ماہوار ہی پڑتے تھے لیکن دفتر کو کرن دیوان خوب سجا کر رکھتے تھے۔ میں اپنا زیادہ وقت وہیں گزارتا تھا اور 'شاہکار' کا کام بھی وہیں بیٹھ کر کرتا تھا۔ ملنے والوں کا بھی، جو اکثر 'شاہکار' کے سلسلے میں آتے تھے، وہیں جمگھٹا رہتا۔

مولانا تاجور کا سلوک میرے ساتھ بہت مشفقانہ تھا۔ انھوں نے قارئین 'شاہکار' سے میرا تعارف بہت اچھے لفظوں میں کرایا اور میری نثر اور میری شاعری کی دل کھول کر تعریف کی۔ صرف یہی نہیں بلکہ ایک مرتبہ تو انھوں نے میرے ایک شعر؎

مجھے زندگی کی دُعا دینے والے
ہنسی آرہی ہے تری سادگی پر

پر اچھا خاصا مضمون لکھ دیا۔ میرا یہ شعر زبان زد خاص و عام ہے اور میرا خیال ہے کہ اس کی مقبولیت میں مولانا کی تحریر کو بڑا دخل ہے۔

ادارتی معاملات میں بھی انھوں نے مجھے پوری آزادی دے رکھی تھی۔ میرا نام پرچے پر مدیرِ معاون کی حیثیت سے چھپتا تھا۔ لیکن مضمون نگاروں کو خطوط میں اپنے ہی نام سے لکھتا تھا اور مضامین ردّ یا قبول کرنے کا بھی مجھے پورا اختیار تھا۔ اس سلسلے میں ایک دو بار مولانا نے بڑی کشادہ دلی کا مظاہرہ کیا۔

ابومحمد امام الدین رام نگری نے اپنے ایک مضمون میں اردو میں لکھنے والے ہندوؤں کی اس روش پر اعتراض کیا تھا کہ وہ اپنی تحریروں میں ہندی اور سنسکرت کے لفظوں کا بہت زیادہ استعمال کرتے ہیں اور اسے انھوں نے اردو کی در پردہ تخریب کا نام دیا تھا۔ میں نے اپنی طرف سے اس کے نیچے نوٹ لکھ دیا کہ اگر مسلمانوں کو اردو میں عربی اور فارسی کے الفاظ استعمال کرنے کا حق ہے تو ہندوؤں کو سنسکرت کے لفظ استعمال کرنے کا حق کیوں نہیں؟ مسلمان اپنی تحریروں میں آیات استعمال کر سکتے ہیں اور ہندو سنسکرت کے اشلوک، ہمارے نزدیک اردو ایک ایسی زبان ہے جس میں پنڈت اور مولوی دونوں ہی اظہارِ خیال کر سکیں۔ یہ نوٹ شائع ہوا تو ابومحمد امام الدین صاحب نے مولانا کو کئی احتجاجی خط لکھے لیکن ہر بار مولانا نے انھیں یہی جواب دیا کہ ایڈیٹر گوپال متّل ہے، میں نہیں؟ آپ کو جو کچھ لکھنا ہے اسی کو لکھیے۔

مولانا کا دل مذہبی اور علاقائی تعصّب سے بالکل پاک تھا۔ پنجاب میں اردو کے فروغ میں ان کا حصّہ شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد کے بعد غالبًا سب سے زیادہ ہے۔ ان کے دوستوں اور نیاز مندوں میں مسلمانوں سے کہیں زیادہ ہندو اور سکھ تھے اور یوپی والوں سے کہیں زیادہ پنجابی۔ ایک بار اپنے ایک نوٹ میں اردو کے پنجابی اہلِ قلم کے متعلق انھوں نے کچھ سخت باتیں لکھ دیں۔ یہ نوٹ مجھے ملا تو میں نے احتجاج کیا کہ جس پرچے کا مدیرِ معاون پنجابی ہو اس پرچے میں یہ تحریر شائع نہیں ہونی چاہیے۔ مولانا کا فوراً جواب ملا کہ آپ پرچے کے ایڈیٹر ہیں اور میں آپ کا مضمون نگار، آپ کو میری تحریر مسترد کرنے کا بھی حق ہے اور اس میں ترمیم کا بھی۔

دفتری امور کے سلسلے میں مولانا سے کچھ زیادہ ملنا نہیں ہوتا تھا لیکن اس کا یہ مطلب

نہیں کہ میں ان کے فیضانِ صحبت سے محروم رہا۔ جب بھی کوئی اہم ادیب ان سے ملنے آتا وہ مجھے بلا لیتے تھے اور غروب آفتاب کے بعد بھی کئی بار میں ان سے ملنے چلا جاتا تھا۔ اگر میں یہ اعتراف نہ کروں تو بہت بڑی ناشکر گزاری ہوگی کہ میرے ادبی ذوق کی نشو ونما میں ان صحبتوں کو بڑا دخل ہے۔

مولانا دھڑلّے کے آدمی تھے اور ظاہر ہے کہ ایسا آدمی دوستوں کے ساتھ دشمن بھی بناتا ہے اور دشمن دوستوں سے زیادہ بااصول اور سرگرم ہوتے ہیں۔ ان کے سب سے بڑے حریف حفیظ جالندھری تھے اور دونوں میں ہمیشہ چپقلش رہی۔ لاہور کے تقریباً سبھی ادیب اور شاعر ان میں سے کسی ایک کے دوست اور دوسرے کے دشمن تھے۔ میں ان معدودے چند لوگوں میں تھا جن کے ان دونوں کے ساتھ دوستانہ مراسم رہے۔ یاد پڑتا ہے کہ جب میں نے 'شاہکار' کی ملازمت اختیار کی تو اس کے بعد پہلی ہی ملاقات میں حفیظ نے پوچھا تھا 'تم وہاں بیٹھ کر میری برائی کرتے ہوگے؟' جواب میں میں نے کہا تھا۔ 'کیا کبھی میں نے تمھارے سامنے تاجور کی برائی کی ہے؟' میرے اس جواب نے انھیں مطمئن کر دیا تھا اور واقعہ یہ ہے کہ میں نے یہ اصول بنائے رکھا کہ ان کی باہمی چپقلش سے الگ رہ کر دونوں ہی کے ساتھ اپنے نیازمندانہ تعلقات قائم رکھوں۔

جہاں تک 'شاہکار' کی عام پالیسی کا تعلّق ہے اس پر یہ الزام تو لگ سکتا تھا کہ وہ غیر مسلم لکھنے والوں کو زیادہ اہمیت دے دیتا ہے، یہ شکایت کسی نے بھی نہیں کی تھی کہ اس کے خلاف بر بنائے مذہب امتیاز برتا جاتا ہے۔ ادارت کے لیے میرا تقرر بجائے خود مولانا تاجور کی بےتعصبی کا ثبوت تھا۔ مجھ سے پہلے پنڈت میلا رام وفا 'ادبی دنیا' کے زمانے میں مولانا کے نائب رہ چکے تھے جنھیں انھوں نے اپنی طرف سے لسان الاعجاز کا لقب دیا تھا اور ان کے حق میں اتنا موثر پروپیگنڈا کیا تھا کہ مولانا ظفر علی خاں کے قلم سے بھی، جو ہندوؤں کے خلاف شمشیر کی طرح چلتا تھا، یہ مصرعہ نکل گیا تھا ع

شعر کہنے کا سلیقہ سیکھ میلا رام سے

اسی طرح اودے سنگھ شائق اور کرپال سنگھ بیدار کو بھی اوپر اٹھانے میں مولانا نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا۔ اودے سنگھ شائق کو مولانا لسان العصر لکھتے تھے اور کرپال سنگھ بیدار مولانا کی

تعریف سے اتنے متاثر ہوئے تھے کہ اپنے آپ کو اقبال کا مدِّ مقابل ہی نہیں بلکہ ان سے نسبتاً بہتر شاعر ہی سمجھنے لگے تھے۔ مولانا نے کسی موڈ میں ان کے متعلّق کہہ دیا تھا کہ اقبال کے کلام میں کجیاں ہوتی ہے لیکن بیدار کے کلام میں پختگی ہے۔ بیدار صاحب نے اسے ان کی ناقدانہ رائے سمجھ لیا اور خلوصِ دل سے اس پر ایمان لے آئے۔

غیر مسلم شاعروں کے خلاف امتیاز برتنا تو کجا مولانا تو ہمیشہ اس کوشش میں رہتے تھے کہ انھیں ڈھونڈ کر سامنے لایا جائے۔ میرا خیال ہے کہ پنڈت ہری چند اختر کو چھوڑ کر ایک بھی اچھا لکھنے والا ہندو یا سکھ نہیں تھا جس کا تعاون 'شاہکار' کو حاصل نہ ہو اور پنڈت ہری چند اختر کے معاملے میں بھی جو چیز دیوار بن گئی تھی وہ ان کا مذہب نہیں تھا بلکہ مولانا تاجور اور جناب حفیظ جالندھری کی غیر مختتم جنگ تھی۔ حفیظ کے حق میں اور مولانا کے خلاف اختر اپنے قلم اور اپنی زبان دونوں کا وافر استعمال کرتے تھے۔ نہ ان سے کبھی کوئی چیز طلب کی گئی اور نہ انھوں نے کبھی بھیجی۔

مولانا تاجور نے اپنی زندگی میں کئی ادبی کارنامے انجام دیے۔ انھوں نے ادبی مرکز کی طرح ڈالی جس کے پیشِ نظر اردو ادب کے فروغ اور اشاعت کا ایک مہتمم بالشان پروگرام تھا اور اس کے لیے اردو کے نامور ترین ادیبوں اور شاعروں کا تعاون حاصل کرنے ہی میں وہ کامیاب نہیں ہوئے بلکہ انھوں نے سرمائے کا انتظام بھی کرلیا۔ 'ادبی دنیا' اور شاہکار' کا اجرا بجائے خود تاریخی اقدام تھے لیکن جیسا کہ انھیں خود اعتراف تھا، اپنے پروگراموں کو کامیابی کی منزل تک پہنچانے میں وہ خاطر خواہ کامیاب نہیں ہوسکے۔ اس کی وجہ غالبًا یہ تھی کہ ان میں انتظامی اور کاروباری سوجھ بوجھ کچھ زیادہ نہیں تھی۔ وہ اپنے رفیقوں اور کارکنوں سے بھی نالاں ہی رہے لیکن میرے خیال میں اس بات کے ڈانڈے ان کے مزاج کے اسی پہلو سے ملتے تھے۔ مولانا ضرورت سے زیادہ امید پرست تھے جب کامیابی کے امکانات سے سرشار ہوتے تو اس سرشاری میں اپنے کارکنوں کو بھی شریک کرلیتے نتیجہ چونکہ توقعات سے ہمیشہ کم نکلتا تھا اس لیے کارکن مولانا کے حسنِ سلوک کے باوجود شکستِ طلسم کے بعد دل برداشتہ ہوجاتے تھے۔ اور یہ بے دلی ان کی صلاحیت کار کو سلب کرلیتی تھی۔ غالبًا میرا ان کا نباہ اسی لیے ہوگیا کہ میں ان کی اس شاعرانہ افتادِ طبع کو ملحوظ رکھ کر حالتِ موجودہ پر ہی قناعت کیے رہتا تھا اور مستقبل کی خوش آئند توقعات کی سرشاری کو اپنے دل و

دماغ پر مسلّط نہیں ہونے دیتا تھا۔

مجموعی طور پر مولانا کا یہ بیان صحیح ہے کہ جن لوگوں نے ان کی ملازمت کی وہ ان کی ملازمت چھوڑنے کے بعد گردشِ روزگار کا شکار ہی رہے۔ خدا کا شکر ہے کہ میرا شمار ان لوگوں میں نہیں۔ لیکن میں ان سے لڑ کر الگ نہیں ہوا تھا۔ ملازمت کا تعلّق ختم ہونے کے بعد بھی وہ مجھے اپنے نیازمندوں کے زمرے میں شمار کرتے رہے اور میرے دل میں بھی آج تک ان کے لیے ویسا ہی احترام موجود ہے۔

ڈاکٹر محمد دین تاثیر

لاہور پہنچنے کے چند ہی دن بعد ایک شام حفیظ نے کہا: 'آؤ تمھیں تاثیر سے ملائیں'۔ حفیظ ماڈل ٹاؤن میں رہتے تھے، لیکن انارکلی میں مرکز تالیف واشاعت کے نام سے انھوں نے ایک دفتر قائم کر رکھا تھا۔ میرا قیام بھی انارکلی میں تھا اور تقریباً ہر روز ہی ان سے ملنے میں ان کے دفتر پہنچ جاتا تھا۔

تاثیر کا گھر شہر کے دوسرے سرے پر تھا۔ گھومتے پھرتے وہاں پہنچے تو لگ بھگ رات ہو چکی تھی۔ تاثیر گھر پر ہی تھے اور صوفی غلام مصطفیٰ تبسم اور کچھ دوسرے حضرات بھی وہاں موجود تھے۔ میں شہر میں نو وارد تھا۔ عمر بھی زیادہ نہیں اور ادب کی دنیا میں بالکل گمنام۔ تاثیر اسلامیہ کالج کے سینئر پروفیسر تھے اور ادب کی دنیا میں ان کے جھنڈے گڑے ہوئے تھے۔ صرف یہی نہیں کہ ان کا نام احترام سے لیا جاتا تھا بلکہ صحیح معنی میں ان کی ہیبت طاری تھی۔ پھر بھی جب حفیظ نے ان سے میرا تعارف کرایا تو وہ مجھ سے اس طرح نہیں ملے، جیسے کوئی بڑا کسی چھوٹے سے ملتا ہے۔ چھوٹتے ہی بولے کچھ شعر سناؤ۔ شعر سنائے تو صرف یہی نہیں کہ انھوں نے اور دیگر شرکائے مجلس نے کھل کر داد دی بلکہ کچھ ایسا برتاؤ کیا کہ میں واقعی خود کو ان کا ہم نشیں اور ہم صحبت محسوس کرنے لگا۔

کچھ دیر بعد تاثیر نے حفیظ سے کہا: 'اب آپ لوگ کھانا کھا کر ہی جایئے'۔ کھانے کے دوران میں میں نے ایک مرتبہ اپنا ہاتھ ترکاری کی طرف بڑھایا تو گوشت کی پلیٹ میری طرف بڑھا کر تاثیر بولے: 'ارے یہ تو گھر پر بھی مل جائے گی، یہ کھا'۔

اس کے بعد حفیظ کے دفتر میں ان سے اکثر ملاقاتیں ہونے لگیں۔ جہاں وہ ہفتے میں دو تین بار ضرور نکل آتے تھے۔صوفی غلام مصطفی تبسم، پنڈت ہری چند اختر اور کچھ دوسرے حضرات بھی وہاں ہوتے تھے اس لیے اچھا خاصہ ادبی محفل کا سماں بندھ جاتا تھا۔ یہ میں نے ہمیشہ محسوس کیا کہ جہاں باقی لوگ ان کی برتری کا اعتراف کرتے تھے۔ وہاں ان کی کوشش ہمیشہ یہی ہوتی تھی کہ اپنی برتری کے احساس کو زائل کردیں۔ بے تکلفی ان کے مزاج کا خاصّہ تھی اور رکھ رکھاؤ کا روگ پالنا ان کے بس میں نہیں تھا۔

بے تکلفی سے وہ اسلامیہ کالج میں اپنے شاگردوں سے بھی پیش آتے تھے۔لیکن طلبا کو صرف یہی نہیں کہ ہمیشہ ان کا اطاعت شعار دیکھا بلکہ ایسا لگتا تھا کہ اساتذہ میں سب سے زیادہ متاثر اور مرعوب وہ انہی سے ہیں۔

ادب کی اقلیم میں ان کا واقعی سکّہ چلتا تھا۔ادب ہی نہیں بلکہ فنونِ لطیفہ کے کسی شعبے میں بھی ایسی کوئی شہرت ان دنوں قائم نہیں ہوئی جس میں ان کا ہاتھ نہ رہا۔ڈاکٹر اقبال کو شہرتِ دوام ملی۔لیکن جن لوگوں نے ان کے جوہر کو سب سے پہلے پہچانا اور ان کی عظمت کی تبلیغ کی، ان میں سرعبدالقادر کے بعد تاثیر ہی کا نام آتا ہے۔عبدالرحمٰن چغتائی کو ایک آرٹسٹ کی حیثیت سے بلند مقام تک پہنچانے میں بھی تاثیر کا بڑا ہاتھ تھا۔

تاثیر جتنے اچھے دوست تھے اتنے ہی خطرناک دشمن بھی تھے اور وار کرتے وقت یہ تک نہیں سوچتے تھے کہ جو شخص ان کی زد میں ہے اس کی حیثیت کیا ہے؟ لوہاری دروازے کے چوک میں ایک معمر شاعر رہتے تھے، غالباً اظہر تخلص کرتے تھے۔اپنے نام کے ساتھ حکیم لکھتے تھے اور اپنے کمرے کے آگے 'شاعری سکھانے کا کالج' کا بورڈ لگا رکھا تھا۔شامتِ اعمال نے جو گھیرا تو کسی بات پر تاثیر سے بگاڑ پیدا کرلی۔تاثیر کہاں بخشنے والے تھے۔'پارس' میں ایک غزل اشاعت کے لیے بھیج دی، اور اس پر یہ نوٹ لکھ دیا کہ یہ غزل صنعتِ توشیح میں کہی گئی ہے۔'پارس' کے مدیر لالہ کرم چند کی بلا جانے کہ صنعتِ توشیح کیا ہوتی ہے۔انھوں نے غزل اسی نوٹ کے ساتھ شائع کردی۔ حکیم صاحب نے غزل دیکھی تو بھنّا کر رہ گئے۔صنعتِ توشیح کا مطلب یہ ہے کہ اگر ہر مصرعہ اوّل کا پہلا حرف لیا جائے اور پھر ان حروف کو ملا لیا جائے تو بامعنی عبارت بن جاتی ہے۔اس صنعت کے

پردے میں تاثیر نے حکیم صاحب کا نام لے کر انھیں ایک فحش گالی دے ڈالی تھی۔

حکیم صاحب تو خیر شکار مردہ تھے۔ تاثیر کی چوٹ کی تاب لانا تو مولانا تاجور کے لیے بھی مشکل ہو جاتا تھا، جن کے پاس علم بھی تھا اور جوڑ توڑ میں بھی مہارت تامّہ رکھتے تھے۔ حلقۂ نیازمندانِ لاہور، جس کی یو پی اور دہلی کے ادیبوں سے اکثر ٹھنی رہتی تھی۔ اس کے سرگرم ترین رکن محمد دین تاثیر ہی تھے۔ دہلی اور یو پی والوں کو پنجابی ادیبوں کے لہجے پر ہی اعتراض نہیں تھا، بلکہ وہ ان کی تحریروں میں زبان و بیان کی غلطیاں بھی ڈھونڈتے رہتے تھے۔ تاثیر بحث کا دروازہ وا رکھنے کے لیے اپنے کلام میں یو پی اور دہلی کے محاورے سے عموماً انحراف کر جاتے۔ مثلاً جب انھوں نے یہ مصرعہ کہا ع

تو نے الفت مجھ سے کرنی ہے تو کر میرے لیے

ہمیں پہلے ہی خبردار کر دیا تھا کہ دہلی والے 'کرنی' اور 'تو نے' کے استعمال پر بدکیں گے۔ دہلی والوں کو بدکنا تھا اور بدکے لیکن تاثیر نے اپنی تائید میں استدلال کی ایک ایسی عمارت کھڑی کر دی جو دہلی والوں کے لیے ناقابلِ نفوذ قلعہ ثابت ہوئی۔ شاید یہ میرا کم عمری کا تاثر ہو لیکن میں ان دنوں یہی سمجھتا تھا کہ تاثیر اپنے علم کے زور سے جو چاہیں ثابت کر سکتے ہیں۔

لیکن اس سب کچھ کے باوجود شعر و ادب کے کسی شعبے میں کوئی پائدار کارنامہ انھوں نے سرانجام نہیں دیا۔ ان کے کلام کی مقدار بہت کم ہے اور نثر میں بھی انھوں نے اپنی کوئی مستقل یادگار نہیں چھوڑی۔ ان کے اکثر احباب اس بنا پر ان کے شاکی رہتے تھے۔ بعض اسے ان کی خوے بے نیازی اور قلندرانہ روش پر محمول کرتے تھے اور بعض یہ سمجھتے تھے کہ ان کے پاس علم تو ہے لیکن جذبے کی کمی ہے۔ حفیظ تو اکثر کہہ دیتے تھے کہ یہ شخص بزورِ علم شعر کہتا ہے۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بات بھی صحیح نہیں۔ ان کے پاس علم بھی تھا اور وہ تنقیدی بصیرت بھی رکھتے تھے۔ انھوں نے سمجھ لیا تھا کہ بہت بڑا شاعر بننا ان کے بس میں نہیں اور ان کے علم اور ان کی حیثیت کا آدمی دوم درجے کا شاعر کیوں بنے؟ پطرس کا خیال بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ بقول ن.م. راشد ان سے ان کی کوتاہ قلمی کا شکوہ کیا گیا تو انھوں نے کہا: 'کسی بانجھ عورت سے یہ کہنا کہ اس کے بچّہ کیوں نہیں ہوتا۔ اس کے زخموں پر نمک چھڑکنا ہے؟'

تاثیر نظریات کا روگ پالنے والے بھی نہیں تھے۔ یہ صحیح ہے کہ لندن سے انجمن ترقی پسند مصنّفین کا جو منشور شائع ہوا اس پر ان کے بھی دستخط تھے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ حلقۂ نیاز مندانِ لاہور کے اکثر اراکین انہی کی وجہ سے 'جو نیت امام کی وہی ہماری' کہہ کر ترقی پسند صفوں میں شامل ہوئے۔لیکن خود تاثیر نے منشور پر دستخط کرنے کے بعد اس تحریک کو بھلا دیا۔ پاکستان کی حمایت یا مخالفت میں بھی انھوں نے کسی جوش کا مظاہرہ نہیں کیا۔البتہ تقسیم کے بعد فوراً ان کی ایک غزل سے ظاہر ہوتا ہے کہ تقسیم سے پنجاب کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی کو جو نقصان پہنچا اس سے انھیں واقعی تکلیف پہنچی۔اس غزل کا ایک شعر ہے ؎

دنیائے چشم و گوش تو برباد ہوگئی
اب کچھ بغیر معرکۂ خیر و شر نہیں

شعر کسی تاویل وتشریح کا محتاج نہیں۔اس کے پیچھے جو کرب ہے اس کا اندازہ انہی لوگوں کو ہوسکتا ہے جنھوں نے اس جنت چشم و گوش کو یعنی تقسیم سے پہلے کے لاہور کو دیکھا ہے۔جس شخص کی انسان دوستی کا یہ عالم ہو کہ وہ انسانی مراسم کے مقابلے میں خیر وشر کو اتنا حقیر سمجھتا ہو اس میں مبلّغ یا مجاہد بننے کی صلاحیت کہاں سے آسکتی ہے؟

تاثیر استادی شاگردی کے قائل نہیں تھے۔لیکن ایسے لوگوں کی کمی نہیں جنھوں نے ان سے ادب میں رہنمائی حاصل کی اور زندگی کا سلیقہ سیکھا۔ان میں میں اپنا شمار بھی کرتا ہوں۔انھیں آنکھوں سے اوجھل ہوئے مدّتیں ہوگئیں لیکن اب بھی بار ہا محسوس ہوتا ہے کہ ان کا چہرہ، ہونٹوں پر وہی مسکراہٹ اور آنکھوں میں متانت کی غیر معمولی چمک لیے سامنے ہے اور وہ مجھ سے کہہ رہے ہیں: 'مِتّل! زندگی یوں بسر کرتے ہیں'۔

مولانا صلاح الدین احمد

نیلا گنبد لاہور میں ایک مختصر سی چائے کی دکان تھی، عرب ہوٹل کے بعد ادیبوں کا یہ دوسرا اڈّہ تھا۔ مولانا صلاح الدین، عاشق بٹالوی اور باری علیگ کے ساتھ یہاں تقریباً ہر شام نشست رہتی تھی۔

محفل میں سنجیدہ گفتگو بالعموم نہیں ہوتی تھی۔ اس کے لیے دوسری جگہیں تھیں اور جب اس دکان پر ادب کی بجائے سیاست موضوعِ گفتگو بننے لگی تو غیر سنجیدگی کا رجحان اور بھی غالب آ گیا۔ دکان کے مالک کانگریسی مسلمان تھے اور شروع شروع میں یہاں آنے والوں میں زیادہ کانگریسی مسلمان ہی تھے لیکن پھر مسلم لیگی بھی آنے لگے اور ہر روز مناظرے ہونے لگے۔

باری علیگ ان دنوں سیاست سے خاص طور پر برگشتہ تھے۔ مذہب اور سیاست کا باہمی تعلق ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا اور کانگریس کے موقف سے بھی انھیں کوئی خاص لگاؤ نہ رہا تھا۔ اس لیے یہ سارے مناظرے انھیں غیر حقیقی سے لگتے تھے۔ لیکن تھے ستم ظریف، اس لیے نوک جھونک سے صرف لطف ہی نہیں لیتے تھے بلکہ اس میں باقاعدہ شریک بھی ہوتے تھے۔ لیکن ان کی شرکت بجائے خود ایک بہت بڑی ستم ظریفی تھی۔ داخل ہوتے ہی آواز لگاتے: 'کون جیت رہا ہے'۔ اور پھر جیتنے والے فریق کی بجائے ہارنے والے فریق کے معاون بن جاتے۔

مولانا صلاح الدین صرف خاموش تماشائی تھے۔ اور انھیں کسی سیاسی بحث میں شریک ہوتے دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ جب ملک تقسیم ہوگیا، لاہور جلنے لگا اور مسلمانوں کے لُٹے ہوئے قافلے پہنچنے لگے تو بھی انھیں کچھ زیادہ متاثر نہیں دیکھا۔ انھیں صرف یہ تشویش تھی کہ 'اردو کا کیا بنے گا؟'

شروع شروع میں ان کا خیال تھا کہ تقسیم سے اردو کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچے گا لیکن پھر انھوں نے محسوس کیا کہ ملک کی تقسیم میں اردو کی فلاح کے لیے ایک اشارۂ غیبی ہے۔ جب اہلِ زبان پنجاب پہنچیں گے تو پنجاب میں اردو کو بڑا فروغ حاصل ہوگا۔

اس قسم کی باتیں سن کر شروع شروع میں ان پر شقاوتِ قلبی کا گمان گزرتا تھا۔ ایک ایسے وقت میں جب سارا ملک مقتل بنا ہوا تھا کوئی شخص انسانی مصائب سے اتنا بے پروا ہو جائے کہ اسے اردو کے مستقبل کے علاوہ اور کچھ سوجھے ہی نہیں، واقعی برہم کر دینے والی بات تھی۔ پھر ستم بالائے ستم یہ کہ مولانا کے چہرے پر ہر وقت مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی اور غم یا غصّے کے کوئی آثار نظر نہیں آتے تھے۔

ہندوؤں کو لاہور سے بھاگتے دیکھ کر بھی انھوں نے صرف اسی قدر کہا: 'متّل صاحب!

یہ لوگ آخر کیوں بھاگ رہے ہیں'۔

اس مرتبہ مجھے اور بھی عجیب سا لگا لیکن اسی شام مجھے باری علیگ کی زبانی ایک ایسی بات معلوم ہوئی کہ میں حیرت میں ڈوب گیا۔

مولانا کا اپنا مکان لاہور کے ایک ہندو علاقے میں تھا اور جب ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے مکانوں کو آگ لگا رہے تھے تو ان کا مکان بھی جل کر راکھ ہو گیا تھا۔

جب مولانا کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی ہوتی اور وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مصائب سے بے پروا صرف اردو کے مستقبل کے بارے میں پریشانی کا اظہار کیا کرتے تھے تو وہ صرف دوسروں کے مصائب سے بے نیاز نہیں تھے بلکہ خود اپنے مصائب سے بھی بے نیاز تھے۔ انھوں نے اردو کے غم کو اتنا اپنا لیا تھا کہ باقی تمام غموں سے بے نیاز ہو گئے تھے۔

ان کی برہمی دیکھنے کا اتفاق صرف ایک بار ہوا۔ فسادات کے زمانے میں بھی میرے معمولات میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ نیلا گنبد کی اسی دکان پر چائے پیتا رہا اور مسلمانوں کے ریستورانوں میں کھانا کھاتا رہا۔ شبانہ آوارہ گردی کا سلسلہ بھی جوں کا توں جاری تھا۔ ایک رات تقریباً ایک بجے مال روڈ کے کسی ریستوران سے نکل کر گھر کی طرف جا رہا تھا اور نشے میں بری طرح دھت تھا، نیلا گنبد کے قریب پہنچا تو سامنے سے باری علیگ اور مولانا صلاح الدین آتے دکھائی دیے۔ قریب آیا تو مولانا نے مجھے آڑے ہاتھوں لیا جو کچھ جی میں آیا کہہ ڈالا، صرف پٹائی نہیں کی۔ اس کے بعد مولانا اور باری علیگ مجھے گھر چھوڑ گئے۔

دوسرے دن ملاقات ہوئی تو بھی مولانا برہم تھے اور جب تک میں نے یہ وعدہ نہیں کیا کہ اب رات کے وقت گھر سے باہر نہیں نکلا کروں گا ان کے چہرے پر مسکراہٹ واپس نہیں آئی۔

مجھے ان سے ذاتی کام کبھی نہیں پڑا لیکن تقریباً سبھی دوست اس سے متفق تھے کہ آدمی انھیں اپنا کام سونپ کر خود بے نیاز ہو سکتا تھا۔

آخری ملاقات ان سے 1960 میں ہوئی۔ میں ایک مشاعرے میں شرکت کے لیے لاہور گیا تھا۔ ان سے ملاقات کرنے کے لیے 'ادبی دنیا' کے دفتر میں گیا۔ دفتر میں بے سروسامانی کا دور دورہ تھا لیکن مولانا کے چہرے پر مسکراہٹ بدستور کھیل رہی تھی۔ تقسیم کے بعد پاکستان میں

اردو کے ناشر اور ادیب خوشحال ہو گئے تھے لیکن مولانا کی حالت میں کوئی نمایاں فرق نہیں آیا تھا اور 'ادبی دنیا' بھی غالباً اس زمانے میں نہیں نکل رہا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ لیکن دونوں کو احساس تھا کہ ملاقات تشنہ ہے۔ آخر طے پایا کہ اسی شام نیلا گنبد کی اسی پرانی چائے کی دکان پر چائے نوشی کی جائے۔

اپنی اس کوتاہی پر میں ہمیشہ نادم رہوں گا کہ میں اس وعدے کو ایفا نہ کر سکا۔ دراصل میں حماقت کی حد تک امید پرست ہوں۔ خیال تھا کہ لاہور کتنی دور ہے چند ہی ماہ بعد پھر آ جاؤں گا، لیکن اس کے بعد لاہور جانا نصیب نہیں ہوا۔ اب جب ان کی موت کی خبر آئی ہے تو اپنی کوتاہی کا احساس اور بھی شدید ہو گیا ہے۔

مولانا صلاح الدین بڑی نپی تلی شخصیت کے مالک تھے اور اپنے اسلوب نگارش اور ادبی نظریوں میں کافی قدامت پسند تھے۔ لیکن ان کے قلب میں بلا کی وسعت تھی۔ اردو کے بیشتر نئے لکھنے والوں کو انہی نے اپنے رسالے کے ذریعے متعارف کرایا اور مرحوم میراجی سے ان کا خوب نباہ ہوتا رہا۔ اب 'ادبی دنیا' کے نئے دور میں وزیر آغا ان کے رفیق کار تھے، اور اردو ادب کو شاعری کے جدید ترین رجحانات سے آشنا کرانے کا فریضہ بھی 'ادبی دنیا' ہی انجام دے رہا تھا۔

مولانا انجمن ساز نہیں تھے لیکن اپنی ذات سے وہ خود ایک انجمن تھے اور پورا لاہور ان کی شخصیت سے بھرا بھرا نظر آتا تھا۔

اسرار الحق مجاز

مجاز کی موت کو کئی سال ہو گئے۔ اس پر یہ مصرعہ پوری طرح صادق آتا ہے ع

خوش درخشید و لے شعلۂ مستعجل بود

دراصل مجاز ہی نہیں بلکہ اس دور کے بیشتر شاعروں اور ادیبوں کا یہی حال تھا کہ وہ بزم شعر و ادب پر کچھ دیر کے لیے چھائے اور اس کے بعد ان کے ذہنی سوتے خشک ہو گئے۔ یہ حقیقت ناگوار سہی لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ بطور شاعر مجاز اپنی موت سے پہلے مر چکا تھا۔ اس سانحے کی ذمّے داری ہندوستانی سماج پر ڈالنا حقائق سے گریز ہے کیونکہ اسی سماج میں متعدد شاعروں نے

اپنے فن کے تمام امکانات اور تقاضوں کو پورا کیا۔ البتہ اس میں اس مخصوص ماحول کو دخل ضرور ہے جو اس صدی کے تیسرے چوتھے عشرے میں پیدا ہو گیا تھا۔ اِس سے پہلے شعروادب کی سرپرستی وہ لوگ کرتے تھے جنھیں ادب سے واقعی کوئی لگاؤ ہوتا تھا۔ لیکن اس دور میں شعروادب کی سرپرستی ان لوگوں کے حصّے میں آئی جو ادب کو صرف ایک وسیلہ سمجھتے تھے۔ یہ لوگ دو گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ پہلا گروہ عشرت پسند نو دولتیوں کا تھا جن کے نزدیک شاعری کا مقصد صرف ان کے نشۂ عشرت کو تیز کرنا تھا۔ ان کی بزم میں شاعر کو جی بھر کر پینے کو شراب ملتی تھی لیکن اس بزمِ عشرت میں شرکت کے بعد شاعر پر کیا گزرتی ہے اس سے انھیں کوئی سروکار نہیں تھا۔

شراب اردو شاعری کا سدابہار موضوع ہے۔ لیکن شراب سے محض شراب کبھی مراد نہیں لی گئی۔ یہ شاعر کے باطنی کیف کا ایک سمبل تھی چنانچہ شراب کے متعلق ایسے لوگوں نے بھی بہت عمدہ شعر کہے ہیں جنھوں نے کبھی اس کا ایک قطرہ بھی نہیں پیا۔ شاعری اور زندگی میں براہِ راست تعلّق پیدا کرنے کے جنون کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ شاعروں کے لیے شراب پینا لازمی ہو گیا خواہ ان کی صحت اس کی بالکل اجازت نہ دیتی ہو۔ اس طرح اس جذبۂ فنا کی فوری تکمیل کا سامان پیدا ہو گیا۔ جو تقریباً ہر شاعر کے دل میں پیدا ہوتا ہے۔

دوسری طرف اربابِ سیاست کا ایک مخصوص گروہ تھا جو ادب کو اپنے سیاسی مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ بنانا چاہتا تھا۔ ان لوگوں نے شاعروں کے ہاتھوں میں پرچم دے دیا اور ایک انقلابِ موہوم کے نشے میں شاعروں کو اتنا سرشار کیا کہ وہ اپنے گردوپیش کے ماحول کو یکسر بھول گئے۔ اس عقیدے نے کہ ان کی قسمت انقلاب کے بعد ہی چمکے گی، ان کے قوائے عمل کو شل کر دیا اور وہ جدوجہد جو زندگی کو زندگی بنانے کے لیے ضروری ہوتی ہے ان کے بس کی نہ رہی۔

مجاز اس اعتبار سے دوہرا نشیری تھا اور یہ دونوں نشے جان لیوا ثابت ہوئے۔ ہندوستانی سماج کو اس کا قاتل قرار دینے والے اس کی زندگی کے واقعات کا مطالعہ کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ مجاز ایک خوشحال اور ذی اثر خاندان میں پیدا ہوا تھا۔ اسے تعلیم حاصل کرنے کے بہترین مواقع حاصل تھے اور تعلیم اس نے حاصل بھی کی۔ یہ بات بھی غلط ہے کہ وہ خوبصورت بیوی حاصل کرنا چاہتا تھا اور اس جنس نایاب کا نہ ملنا ہی اس کی دیوانگی کا باعث ہوا۔ عصمت چغتائی

تو ہمیں یہاں تک بتاتی ہیں کہ مجاز کے زمانۂ تعلیم میں علی گڑھ کی لڑکیاں اس کے نام کی پرچیاں ڈالا کرتی تھیں کہ وہ ان کی قسمت میں ہے یا نہیں۔ پھر شاعروں کو ان کی پسند کی لڑکیاں فراہم کرنا سماج کا فرض کب سے ٹھہرا؟ کیا ترقی پسند اپنی تمام تر انقلابیت کے باوجود یہ سمجھتے ہیں کہ اس معاملے میں بیچاری لڑکی کی پسند کو کوئی دخل نہیں۔ قدیم مصر میں ہر سال حسین ترین لڑکی کو دریائے نیل کی بھینٹ چڑھا دیا جاتا تھا۔ کیا ترقی پسند شاعروں نے اب دریائی دیوتاؤں کی حیثیت اختیار کر لی ہے کہ ان کی بارگاہ میں حسین لڑکیوں کو بھینٹ چڑھانا ضروری ٹھہرے۔

مجاز شراب سے آخری وقت تک نجات حاصل نہ کر سکا لیکن ایسے شواہد موجود ہیں کہ موت سے قبل ترقی پسندی کے نشے سے اسے نجات مل گئی تھی۔ اپنے استرداد کا سنجیدگی سے اظہار اس وقت اس کے بس کی بات نہیں تھا اس لیے یہ صرف لطیفوں اور طنزیہ فقروں میں ظاہر ہوا۔

ایک غالی اشتراکی نقاد جب اسے آنے والے انقلاب کا یقین دلا رہا تھا تو اس نے کہا: 'بھئی جب انقلاب آئے گا تو کہاں سے دیکھیں گے؟' اسی طرح جب اس سے 'بڑھے چلو' قسم کی نظمیں لکھنے کا مطالبہ کیا گیا تو اس نے کہا: 'قوم کہیں پڑھتے پڑھتے بولا تو نہیں جائے گی'۔ اور جب اسے 'پیس' پر نظم لکھنے کو کہا گیا تو اس نے جواب دیا: 'بھئی ہم تو کٹ پیس پر نظم لکھیں گے'۔

اس قسم کے لطیفے اس شدید ذہنی بیزاری کے مظہر ہیں جو ادب کی منصوبہ بندی کرنے والوں کے خلاف اس میں پیدا ہو گئی تھی۔

مجاز ترقی پسند تحریک میں اس وقت شریک ہوا جب اس کا کوئی واضح مفہوم متعین نہیں ہوا تھا۔ ان دنوں صرف مجاز ہی نہیں میراجی بھی ترقی پسند سمجھے جاتے تھے۔ جب اس تحریک کے اشتراکی خدوخال نمایاں ہونے لگے تو وہ اس تحریک سے الگ ہو گیا۔

جگر مرادآبادی

جگر صاحب بہ یک وقت اردو کے محبوب ترین اور محترم ترین شاعر تھے اور ان کی یہ حیثیت ان کے زمانۂ رندی میں بھی قائم رہی اور زمانۂ متانت میں بھی۔ ان کے زمانۂ رندی میں اصغر گونڈوی، رشید احمد صدیقی اور دوسرے عمائدینِ ادب نے ان کے تمام تر لااُبالی پن کے باوجود

ان سے بے انتہا محبت کی اور ان کے دورِ متانت میں بھی جملہ رندانِ بزمِ ادب نے ان کا پورا احترام کیا۔

اس پذیرائی کا اہم ترین پہلو یہ ہے کہ یہ جگر صاحب کی تمام تر خوٗ ے بے نیازی کے باوجود ہوئی۔ موجودہ دور میں تقریباً سبھی شاعروں نے اپنا پروپیگنڈہ کیا اور اس پروپیگنڈے میں اپنے محاسنِ شعری سے کہیں زیادہ غیر ادبی عوامل کا سہارا لیا۔ کسی نے مذہب کے نام پر دکان چمکانے کی کوشش کی اور کسی نے سیاست کے نام پر۔ جگر اس دور کے غالباً واحد بڑے شاعر تھے جنھوں نے تکمیلِ فن کو ہی مقصدِ زندگی سمجھا۔

مشاہیر کی وسعتِ قلب کا ذکر کرتے وقت یہ اکثر لکھا جاتا ہے کہ وہ چھوٹوں بڑوں کو ایک نظر سے دیکھتے ہیں۔ لیکن جگر صاحب کا وصف یہ تھا کہ وہ اپنے سے چھوٹوں کا بڑوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ احترام کرتے تھے اور ان کی عزّت اس حد تک کرتے تھے کہ بسا اوقات اس سلسلے میں اپنے منصب تک کو بھول جاتے تھے۔ مجھے ماجد حسن فریدی کا بیان کردہ ایک واقعہ یاد آتا ہے۔

غالباً سنہ چھیالیس کا ذکر ہے، کرائسٹ چرچ کالج (کان پور) میں مشاعرہ ہوا۔ بھاری بھرکم اور چھوٹے موٹے ہر قسم کے شعرا آئے، جگر صاحب بھی تھے، کوئی بات منتظمین کی انھیں ناگوار گزاری اور انھوں نے مشاعرے میں غزل سنانے سے انکار کر دیا۔ تمام لوگوں نے اصرار کیا لیکن انھیں نہ غزل پڑھنا تھی نہ پڑھی۔ دوسرے دن حسرت موہانی سے ملاقات کرنے گئے، وہاں اوروں نے غزل پڑھی لیکن انھوں نے وہاں بھی نہ سنائی۔ شام کو وہ ایک معمولی دکاندار حاجی (کانپور کا ایک مٹھائی والا) سے ملنے گئے۔ تھوڑی دیر تک بیٹھے رہے۔ حاجی نے کہا: 'یار بہت دنوں سے کچھ سنا نہیں، آج تو سنا دو' اور انھوں نے ایک منٹ توقف کے بعد جھوم جھوم کر غزل سنانی شروع کر دی۔ اور ایک اور دو اور تین عدد غزلیں حاجی کی نذر کر دیں۔ حاجی بھی جھوم جھوم کر داد دیتا رہا۔ (تحریک، جنوری 1954)

مروّت ان کی بہت بڑی کمزوری تھی۔ 1958 میں ساہتیہ اکادمی کے انعام کے سلسلے میں وہ دہلی تشریف لائے تو ان کی صحت بالکل جواب دے چکی تھی۔ دہلی میں خادمانِ اردو کو اس صورتِ حال کا پورا پورا احساس تھا لیکن اس کے باوجود یہ چاہتے تھے کہ اس موقع پر ان کی خدمت

میں پبلک طور پر سپاس نامہ پیش کیا جائے ۔ طے یہ پایا کہ ان کے اعزاز میں ایک دعوت دی جائے جس میں نہ ان سے شعر سنانے کا مطالبہ کیا جائے اور نہ تقریر کا۔ وہ صرف چند منٹ کے لیے جلسے میں آ کر بیٹھ جائیں۔ میں اور حمیدہ سلطان یہ گزارش لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انھوں نے ایک لمحے کے توقف کے بغیر ہماری تجویز قبول فرمالی اور یہاں تک کہا کہ میں چند منٹ کے لیے ہی نہیں آؤں گا بلکہ باقاعدہ وہاں بیٹھوں گا۔ شام کو آل احمد سرور پہنچے تو انھوں نے اس تجویز کی مخالفت کی اور ہمیں مشورہ دیا کہ ہم اس پروگرام سے دست کش ہو جائیں۔ ہم نے ان کا مشورہ مان لیا لیکن جگر صاحب یہی کہتے رہے کہ جہاں تک میرا تعلّق ہے میں ہر حال میں آنے کے لیے تیار ہوں۔

اس پروگرام کو مسترد کر دینے سے بھی جگر صاحب کو کوئی آرام نہیں ملا۔ ان کے میز بان کی ہر احتیاط کے باوجود کہ انھیں پورا پورا آرام ملے، ملنے والے جوق در جوق پہنچتے رہے اور جگر صاحب بستر سے اٹھ اٹھ کر ان سب کا استقبال کرتے رہے۔ صرف یہی نہیں کئی بار انھوں نے اپنا کلام بھی سنایا جس کا ناگوار اثر ان کی طبیعت پر پڑے بغیر نہ رہا۔

غزل کا صحیح مقام ہوس اور تصوّف کے درمیان ہے اور جگر اسی مقام سے شعر کہتے تھے۔ دوسرے شاعروں کی طرح ان پر بھی معصیت کا دور آیا لیکن اس دور میں بھی تمرد اور الحاد کے بجائے عجز و ندامت کا پہلو موجود تھا۔ مدہوشی کے عالم میں بھی وہ یہی پکارتے رہے کہ ؂

اے رحمتِ تمام مری ہر خطا معاف
میں انتہائے شوق میں گھبرا کے پی گیا

یہی چیز ان کو بچا گئی۔ معصیت کا دور گزر گیا اور ایک عجز رندانہ ان کی فطرت کا مستقل جز و بن گیا۔ پاکبازانہ زندگی اختیار کرنے کے بعد بھی زہد کی خشکی ان کے مزاج میں بار نہ پا سکی۔ انھیں رندِ پارسا کہنا اس اصلاح کا موزوں ترین استعمال ہے۔ غزل کے لیے اسی مزاج کی ضرورت ہے۔

ان کا عشق جسم کا مطالبہ نہیں بلکہ رُوح کا تقاضا تھا۔ یہ شعر صرف وہی کہہ سکتے تھے ؂

گدازِ عشق نہیں کم جو میں جواں نہ رہا
وہی ہے آگ مگر آگ میں دھواں نہ رہا

ان کی موت پر متعدد مشاہیر نے انھیں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے لیکن سب سے زیادہ پتے کی بات ایک نوجوان ادیب خلیل الرحمٰن اعظمی نے کہی ہے:

''آخر وقت تک جگر کی شاعری میں پھیکا پن نہیں آیا۔ ان کی آواز دوسرے شعرا کی طرح عمر ڈھلنے کے بعد پتلی نہیں ہوئی۔ وہ ستّر سال کی عمر کو پہنچ کر بھی ہمارے لیے تبرّک نہیں بنے۔ جگر اپنی عمر کی کسی منزل میں زمانہ ماضی کے شاعر نہیں سمجھے گئے۔ ان کی موت کے بعد ایسا لگتا ہے، اردو زبان نے اپنا ایک جوان بیٹا کھو دیا ہے۔''

حفیظ جالندھری

مادّی اعتبار سے کامیاب ترین شاعر حفیظ جالندھری تھے۔ وہ 'شاہنامۂ اسلام' لکھ کر معزّزین کی صف میں شامل ہو گئے تھے اور اپنی کوٹھی بھی بنالی تھی لیکن اپنی اس کامیابی پر غرّہ کرتے انھیں کبھی نہیں دیکھا۔ دوستوں سے دوستوں ہی کی طرح ملتے اور اپنے معزّز ہونے کا احساس زائل کرنے کے لیے اکثر ضلع جگت پر بھی اتر آتے۔ شعر بھی وہ بدستور محنت سے کہتے تھے اور 'مستند ہے میرا فرمایا ہوا' کے مقولے پر عمل پیرا نہیں تھے۔ قلندر ان سے بہرحال نالاں تھے اور اکثر یہی سمجھا جاتا تھا کہ ان کی کامیابی میں صرف ان کی خوش گلوئی کو دخل ہے۔ اس عام غلط فہمی سے جس شاعر کو فائدہ پہنچا وہ احسان دانش تھے۔ احسان دانش خوش گلو تھے۔ بے حد محنتی تھے اور فقیرانہ وضع رکھتے تھے۔ کافی دنوں تک وہ محنت مزدوری کر کے پیٹ پالتے رہے تھے اور خود کو مزدور شاعر لکھتے تھے۔ خوش گلوئی کے سوا باقی تمام باتوں میں وہ حفیظ جالندھری کی ضد تھے۔ اس طرح وہ ان تمام لوگوں کے لیے جو ناکامی کو مستحسن اور کامیابی کو ایک طرح کا جرم سمجھتے تھے، ہیرو بن گئے اور مشاعروں میں انھیں حفیظ کے مقابلے میں انتقاماً داد دی جانے لگی۔ حفیظ کے پرانے رقیب مولانا تاجور بھی احسان دانش کی مدد کو آگے بڑھے اور میزانِ نقد میں بھی انھیں احسان کا پلڑا بھاری نظر آنے لگا۔

جنگ کے طفیل ادیبوں اور شاعروں کے لیے روزگار کے دروازے کھل گئے۔ فیض احمد فیض، چراغ حسن حسرت اور دوسرے کئی ادیب فوج میں ملازم ہو گئے۔ آل انڈیا ریڈیو میں بہت

سے ادیبوں کو پہلے ہی ملازمت مل چکی تھی۔ اب جو باقی تھے وہ بھی اس میں کھپ گئے۔ باقاعدہ تعلیم کی کمی حفیظ کے لیے سدِّ راہ تھی لیکن انھوں نے اپنی تگ و دو سے اس مشکل پر قابو پالیا۔ حکومت ہند نے سانگ پبلسٹی کے نام سے شاعری اور موسیقی کے ذریعے جنگی پرچار کا محکمہ قائم کیا تو اس کی ڈائرکٹری انہی کے حصّے میں آئی۔ آدمی زیرک تھے اور اپنی محدودیتیں ان کی نظر میں تھیں۔ لہٰذا اپنے نائب کے طور پر انھوں نے پنڈت ہری چند اختر کا انتخاب کیا جو تعلیم یافتہ بھی تھے اور سرکاری ملازمت کے طویل تجربے کے باعث دفتری امور سے بھی بخوبی واقف تھے۔

یہ محکمہ مشاعرے بھی کراتا تھا اور گانے والیوں کے لیے شاعروں سے جنگ کی حمایت میں گیت بھی لکھواتا تھا۔ اس تقرر سے پہلے اکثر و بیشتر شاعر حفیظ کے سخت خلاف تھے جس میں ان کے مزاج کی کسی خامی سے کہیں زیادہ ان کی غیر معمولی مالی کامیابی کو دخل تھا لیکن جیسے ہی وہ سانگ پبلسٹی کے ڈائرکٹر بنے، شاعروں کو ان کی ذات اور ان کے کلام میں ہر قسم کے محاسن نظر آنے لگے۔ یہ بات حفیظ کے حق میں جاتی ہے کہ انھوں نے کسی شاعر کے خلاف بغض سے کام نہیں لیا اور مشاعروں میں شرکت اور گیت نویسی کے سلسلے میں جس شاعر کو جو فائدہ وہ پہنچا سکتے تھے، اس سے انھوں نے دریغ نہیں کیا۔ مجھ سے وہ پہلے ہی کی طرح تپاک اور گرم جوشی سے ملتے رہے بلکہ انھیں یہ شکایت بھی تھی کہ اتنے قریبی تعلقات کے باوجود میں ان کی مقتدر حیثیت سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتا۔ ایک دن ترنگ میں آئے تو کہنے لگے: 'متّل! مجھ سے چوہے تک فائدہ اٹھا رہے ہیں لیکن تو کوئی فائدہ نہیں اٹھاتا۔' میں نے جواب میں کہا: 'میں چوہا نہیں ہوں'۔

حفیظ کی شہرت کا انحصار غزل اور ہلکے پھلکے گیتوں پر تھا اور یہ واقعہ ہے کہ ان کے محکمے سانگ پبلسٹی نے جنگ کی حمایت میں جو گیت لکھوائے ان میں بہترین گیت حفیظ ہی کا تھا۔

یہ اڑوسن پڑوسن چاہے کچھ کہے
میں تو چھورے کو بھرتی کرا آئی ری

ظاہر ہے کہ اڑوسن اور پڑوسن سے مراد کانگریس اور مسلم لیگ تھیں جو دونوں ہی حمایتِ جنگ کے معاملے میں مین میخ نکال رہی تھیں۔

سانگ پبلسٹی کا ڈائرکٹر بننے کے بعد حفیظ کے گرد مداحین کا ہجوم جمع ہوا، تو وہ محسوس

کرنے لگے کہ یہ شہرت ان کے لیے کافی نہیں اور انھیں دانشوری کے میدان میں بھی جھنڈے گاڑنے چاہئیں۔ انھوں نے 'آزادی' کے عنوان سے ایک نظم لکھی جس میں آزادی کے منفی پہلو بیان کرنے کے بعد تان یہاں توڑی تھی ؎

جب تک چوروں، راہزنوں کا ڈر دنیا پر غالب ہے
پہلے مجھ سے بات کرے جو آزادی کا طالب ہے

اپنے قصرِ دانشوری کی بنیاد وہ اس نظم اور اس قسم کی ایک آدھ اور نظم مثلاً 'اب خوب ہنسے گا دیوانہ' پر رکھنا چاہتے تھے لیکن اس معاملے میں کامیابی انھیں نہ ہونا تھی نہ ہوئی۔

ایک دن ماڈل ٹاؤن میں میں ان کا مہمان تھا۔ انھوں نے اپنی نئی نظمیں مجھے سنائیں اور ان میں دانشوری کے جو نکات و رموز تھے ان کی تشریح بھی فرماتے گئے۔ جلد ہی انھوں نے محسوس کر لیا تھا کہ میں متاثر نہیں ہو رہا ہوں۔ اس پر انھوں نے اپنا تازہ گیت 'بس درشن درشن میرا' ترنّم سے پڑھنا شروع کر دیا۔ میں نے حفیظ کو مشاعروں میں بھی سنا ہے اور محدود اور مختصر نشستوں میں بھی لیکن اس دن ان کی آواز میں کچھ اور ہی جادو تھا اور ان کا یہ گیت بھی ان کے بہترین گیتوں میں ہے۔ مجھ پر وجد کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔

اپنی اس شہرت سے کہ وہ ہلکے پھلکے شاعر ہیں، اوپر اٹھنے کی کوشش حفیظ نے 'شاہنامۂ اسلام' لکھ کر بھی کی تھی۔ اپنی اس تصنیف سے انھیں پیسہ بھی ملا اور شہرت میں اضافہ بھی ہوا۔ انھیں 'شاہنامۂ اسلام' سنانے کے لیے اسلامی جلسوں میں مدعو کیا جاتا لیکن جلسے کے بعد جو ادبی نشستیں ہوتیں ان میں لوگ غزل اور گیت کا مطالبہ ہی کرتے۔ پیامی شاعر کی حیثیت سے ان کی کوئی خاص پذیرائی نہ ہو سکی۔

پنڈت ہری چند اختر

پنڈت ہری چند اختر جو سانگ پبلسٹی کے شعبے میں حفیظ جالندھری کے نائب بنے، بڑے ذہین اور ذی علم آدمی تھے۔ اردو زبان اور اردو ادب کے متعلق ان کی معلومات کا یہ عالم تھا کہ یہ بات بجا طور پر کہی جا سکتی تھی کہ جس چیز کا انھیں علم نہیں وہ اس قابل ہی نہیں کہ اسے جانا

جائے۔ ان کا مجھ پر ایک احسان بھی ہے جس کی بنا پر میں انھیں ہمیشہ اپنا استاد سمجھتا رہوں گا۔ اپنی ادبی زندگی کے آغاز میں ایک دن میں حفیظ جالندھری اور ان کے پاس بیٹھا تھا۔ موضوعِ گفتگو یہ تھا کہ اگر ادب کو ذریعۂ معاش بنانا ہو تو صرف شاعری سے کام نہیں چلتا، ضروری یہ ہے کہ نثر نگاری میں کمال حاصل کیا جائے۔ نثر نویسی پر بات چلی تو ہری چند اختر نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا 'متّل! نظم میں وزن کا لحاظ تو ایک احمق بھی رکھ سکتا ہے لیکن نثر میں وزن پیدا کرنا مشکل ہے'۔ میں نے ان کی اس بات کو گرہ سے باندھ لیا۔ میرا خیال ہے کہ میں اگر بری بھلی نثر لکھ لیتا ہوں تو اس میں ہری چند اختر کی اس راہ نمائی کو بڑا دخل ہے۔ بعد میں جب وہ میری نثر کی داد دیا کرتے تھے تو میں انھیں ان کا قول یاد دلاتا تھا۔ اس بنا پر جب میں ان کی شاگردی کا اعتراف کرتا تو وہ کہا کرتے تھے کہ یہ بات تو میں نے تقریباً ہر نوجوان سے کہی ہے اور تم سے تو بڑے ہی سرسری طور پر کہی تھی۔

پنڈت ہری چند اختر جتنے ذہین اور ذی علم تھے اتنے ہی بذلہ سنج بھی تھے۔ لطیفہ گوئی میں عبدالمجید سالک کو چھوڑ کر کوئی بھی ان کا مدِّ مقابل نہیں تھا۔ اچھے اچھوں کو چٹکیوں میں اڑا دیتے۔ حلقۂ نیاز مندانِ لاہور کے حریفوں کو استدلال سے زک دینے کا کام محمد دین تاثیر کرتے تھے اور ان پر استہزا کے تیر برسانا ہری چند اختر کا کام تھا۔

ایک صاحب پنڈت راج نرائن ارمان تھے۔ ان کا مولد دہلی تھا۔ لیکن لاہور کو انھوں نے اپنا مستقل وطن بنا لیا تھا۔ زبان دانی پر بہت نازاں تھے اور اس سے بھی زیادہ اس بات پر کہ وہ داغ کے شاگرد ہیں۔ بات بات پر کہتے تھے انھیں کیا گھمنڈ ہے، میں داغ کا شاگرد ہوں۔ گھمنڈ کا لفظ جب ان کی بڑی بڑی مونچھوں سے ہو کر گزرتا تو سننے والوں کو 'گھمنڈا' سنائی دیتا۔ حلقۂ نیاز مندانِ لاہور سے ان کی ٹھنی تو حسبِ معمول ہری چند اختر میدان میں اترے۔ 'پارس' میں 'گھمنڈا' کے عنوان سے دوزخی کے نام سے ایک نظم شائع ہوئی جس کا ایک شعر تھا؎

تو داغ کا استاد ہو یا داغ کا شاگرد
داغی ہیں مگر سب ترے اشعار گھمنڈا

ہر شخص جانتا تھا دوزخی کے پردے میں پنڈت ہری چند اختر ہی ہیں۔

اپنی بذلہ سنجی کی بدولت پنڈت ہری چند اختر کو بلا کی مقبولیت حاصل تھی۔ ہر محفل میں ان کی پذیرائی تھی۔ دوست ان کے مدّاح تھے اور دشمن ان سے خائف تھے لیکن یہی مقبولیت اور پذیرائی ان کی ادبی زندگی کے لیے زہر ہلاہل بن گئی کیونکہ ان کا بیشتر وقت معرکہ آرائیوں اور لطیفہ گوئیوں میں گزر جاتا تھا۔ وہ سنجیدگی سے علمی یا ادبی کام کرتے تو اردو زبان اور ادب کی قابلِ قدر خدمت انجام دے سکتے تھے۔ حفیظ نے اپنے افسانوں کا مجموعہ شائع کیا تو زیبِ عنوان ان کے اس شعر کو بنایا تھا؎

مسکرادے ، قصّہٴ امید کردے مختصر
یا بڑھالے چل ، ذراسی بات کو افسانہ کر

پنجاب میں استادی کے مدّعی تو بہت تھے لیکن استادانہ شعر ہری چند اختر ہی کہتے تھے؎

پہلے تو شرمِ ضبط سے چپ تھے حضورِ دوست
پھر حوصلے سے کام لیا اور رو دیے

نگاہیں دشمنوں کو ڈھونڈتی ہیں
ہجومِ دوستاں ہے اور میں ہوں

ملاقاتیں بھی ہوتی ہیں، ملاقاتوں کے بعد اکثر
وہ مجھ کو بھول جاتے ہیں میں ان کو یاد کرتا ہوں

استادانہ مہارات کے ساتھ ان کی شاعری میں جذبہ بھی تھا۔ یہ اجتماع بہت کم ہوتا ہے لیکن یہ سارا فضل وکمال ع

صرفِ پیمانہ ہوا وقفِ صنم خانہ ہوا

پیمانے اور صنم خانے کی بات یہاں صرف زینتِ سخن کے لیے ہے ورنہ پنڈت ہری چند اختر ان دونوں سے بے نیاز تھے اور میرا خیال ہے کہ جہاں ان کی علمی اور ادبی صلاحیتوں کو ان

کی بذلہ سنجی اوران کے لااُبالی پن نے نقصان پہنچایا وہاں ان کی غیر معمولی شرافت بھی ان کی تباہی کا باعث بنی۔ شرافت کو انھوں نے اپنا نصب العین بنالیا تھا جس پر قربان ہوجانا ان کی زندگی کی معراج تھی۔ ان کے بیشتر دوست شرابی تھے۔ وہ ان کی محفلوں میں برابر شریک ہوتے تھے اور شرابی جوحرکتیں بہک کر کرتے ہیں انھیں وہ ان کا ساتھ نباہنے کو بن پیے ہی کرتے رہتے۔ ان کے پائے زہد کو لغزش تو کبھی نہیں ہوئی البتہ اس مظاہرۂ پاکبازی سے ان کے انا کی تسکین ضرور ہوتی تھی اور کبھی کبھی تو ان کی پیشانی پر نورِ شہادت بھی جھلک اٹھتا تھا۔

عورتوں کے معاملے میں بھی وہ غیر معمولی طور پر پاکباز تھے۔ اپنے رنگین مزاج دوستوں کے ساتھ طوائفوں کے کوٹھے پر جانا ان کے نزدیک ممنوع نہیں تھا لیکن وہاں جا کر طوائفوں سے وہ کوئی شریفانہ قسم کا رشتہ ضرور قائم کر لیتے تھے۔ سانگ پبلسٹی کے شعبے کی ملازمت کے دوران میں ان کا واسطہ طوائفوں سے اکثر پڑتا تھا۔ یہ طوائفیں عملے کے دوسرے اراکین کے لیے خواہ کتنی ہی مصیبت کا باعث بنی ہوں لیکن پنڈت جی اپنے حصارِ پاکدامنی میں مگن رہے، بہن کا لفظ ہمیشہ ان کے لیے سپر کا کام دیتا رہا۔ لاہور کی ایک طوائف البتہ اس معاملے میں کچھ زیادہ ہی ستم ظریف نکلی۔ یہ سانگ پبلسٹی میں ان کی ملازمت سے پہلے کی بات ہے۔ پنڈت جی دن کے وقت اس کے کوٹھے پر بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے عین اس وقت جب پنڈت جی کا پندارِ پاکبازی اپنے پورے عروج پر تھا اس ستم پیشہ نے کہا: 'پنڈت جی آج کل لوگ بہت سیانے ہو گئے ہیں۔ تحریک یہاں سے حاصل کرتے ہیں اور کارروائی گھر جا کر'۔

ظلم پذیری بھی ان کی فطرتِ ثانیہ تھی۔ ان کے مراسم بہت دور تک تھے۔ اگر وہ ان مراسم کو اپنے دنیاوی عروج کے لیے استعمال کرتے تو کامیابی کی بڑی اونچی منزل پر پہنچ سکتے تھے لیکن حرفِ مطلب زبان پر لانا ان کی شانِ بے نیازی کے منافی تھا۔ اس بے نیازی کے باوجود وہ عجیب وغریب قسم کے لوگوں سے ملتے رہتے اور انھیں خوش رکھنے کی کوششوں میں بھی لگے رہتے۔ سیّد انشا کا شعر ہے ؎

صاحب کے ہرزہ پن سے ہر ایک کو گلہ ہے
میں جو نباہتا ہوں میرا ہی حوصلہ ہے

سیّد انشا تو 'صاحب کے ہرزہ پن' کو خالص دنیاوی مقاصد کے پیشِ نظر برداشت کرتے تھے لیکن ہری چند اختر یہ فرض بے غرضانہ طور پر انجام دیتے رہے۔

کسی منگل وار کو نہا دھو کر ہنومان جی کے مندر جا کر وہ اگر تھوڑا سا مردانگی کا دان مانگ لیتے تو یہ ان کے لیے بھی مفید ہوتا اور اردو ادب کے لیے بھی۔

کرشن چندر

ترقی پسند مصنّفین پنجاب کے باہر کافی معتوب تھے اور انھیں کمیونسٹ سمجھ کر حکومت ان کے درپے آزار بھی رہتی تھی۔ لیکن پنجاب میں یہ عجیب بات تھی کہ ترقی پسند ادب کے سرگرم حامی صرف یہی نہیں کہ سرکار کے معتوب نہیں ہوئے بلکہ اس تحریک میں امتیاز ان کے دنیاوی فروغ کا باعث بن گیا اور انجمن ترقی پسند مصنّفین کی سکریٹری شپ کو تو سرکاری ملازمت کے حصول کا زینہ سمجھا جانے لگا۔ انجمن کے پہلے سکریٹری سومناتھ چِب تھے جو انگلستان سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرکے آئے تھے۔ سکریٹری بننے کے کچھ ہی دن بعد انھیں اچھی سرکاری ملازمت مل گئی۔ ان کے جانشین کرشن چندر بنے جن کی دوستی کا مجھے شرف حاصل تھا۔ کچھ ہی مدّت بعد وہ بھی آنکھوں میں آنسو بھر کر تشریف لائے اور یہ دردناک خبر سنائی کہ انھوں نے سرکاری ملازمت قبول کرلی ہے یا خود ان کے اپنے الفاظ میں خود کو فروخت کردیا ہے۔ وہ غالبًا اس امید میں آئے تھے کہ میں ان سے اظہار ہمدردی کروں گا اور بہت ممکن ہے کہ گالیاں بھی بکنے لگوں لیکن جب میں نے مبارکباد پیش کی تو انھیں یک گونہ صدمہ ہوا۔ وہ اپنے جذبۂ شہادت کی تسکین چاہتے تھے۔ میں نے اپنی حماقت سے انھیں اس لذّت سے محروم کردیا۔

کرشن چندر مجھ پر واقعی مہربان تھے۔ وہ خود سلیقے کی زندگی بسر کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ میں بھی سلیقے کی زندگی بسر کروں۔ اپنے لباس کے بارے میں وہ کافی محتاط تھے اور مراسم قائم کرنے اور انھیں نباہنے کے آداب بھی انھیں آتے تھے۔ مجھ سے اکثر کہا کرتے تھے کہ کامیابی

کے لیے دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ اچّھا لباس اور رہنے کی معقول جگہ جہاں دوستوں کی مدارات کی جا سکے۔ ان دنوں ان کے ہیرو ملک راج آنند تھے جن کی کچھ کتابیں یورپ میں چھپ چکی تھیں۔ ایک بار وہ آئے تو میں، کرشن چندر اور نریندر ناتھ (ان دنوں ڈرامہ لکھا کرتے تھے آج کل سرکاری ملازمت میں ہیں) ان سے ملنے کے لیے سیٹھ سومناتھ چپ کی کوٹھی پر گئے۔ ملاقات کا وقت کرشن چندر نے طے کیا تھا۔ لیکن جب ہم وہاں پہنچے تو نہ کوٹھی پر ملک راج آنند تھے اور نہ صاحبِ خانہ۔ ہم تینوں انتظار کرتے رہے اور وہ کافی دیر بعد آئے۔ اس دوران میں میں نے اور نریندر ناتھ نے کئی بار کرشن چندر سے، جو خود بھی کافی برہم ہو رہے تھے، کہا کہ ہم مزید انتظار نہ کریں لیکن کرشن چندر نے ہمیں روکے ہی رکھا۔

کنہیّا لال کپور، کرشن چندر کا اکثر مذاق اڑایا کرتے تھے کہ یہ کمیونسٹ ہونے کا مدّعی ہے لیکن جو کریم استعمال کرتا ہے، اس پر بورژوا لکھا ہوتا ہے۔ ایک اعتبار سے یہ زیادتی بھی تھی کیونکہ کرشن چندر ان دنوں بورژوا زندگی ہرگز بسر نہیں کر رہے تھے اور ان کا قیام ایک ہندو ہوسٹل میں تھا جس میں کم استطاعت کے لوگ ہی رہتے تھے اور اچھا لباس بھی وہ غالبًا ان دنوں اپنے افلاس کو چھپانے یا اپنے لیے ترقی کی راہیں نکالنے کے لیے ہی استعمال کرتے تھے۔

کرشن چندر اور اُپندر ناتھ اشک کی آمد اس بات کا اعلان تھی کہ اب ادب کے میدان میں قلندری کا دور ختم ہوا۔ دوسرے ادیبوں کے برعکس، جو لااُبالی تھے اور ادبی کام کو کاروبار زیاں سمجھ کر کرتے تھے، یہ دونوں حصولِ کامیابی کے واضح پروگرام کے تحت ہر قدم ناپ تول کر اٹھاتے تھے۔ کرشن چندر اس معاملے میں زیادہ زیرک تھے۔ وہ ہر جریدے کے مدیر کی ناز برداری کرتے اور کسی نہ کسی حیلے سے اپنے حق میں کچھ لکھوا لیتے جب ان کی کوئی تحریر کہیں شائع ہوتی تو وہ اپنے دوستوں سے کہتے کہ وہ اس کی تعریف میں مدیر کو خط لکھیں۔ 'ادبِ لطیف' کی ادارت ان دنوں مرزا ادیب کے سپرد تھی جو بڑے ہی شریف اور مظلوم صورت آدمی تھے اور ان کی شرافت سے فائدہ اٹھا کر دوست اکثر ان کا مذاق اڑاتے رہتے تھے۔ ایک بار وہ، میں، کرشن چندر اور مرحوم چودھری برکت علی 'ادب لطیف' کے دفتر میں بیٹھے تھے۔ 'صحرا نورد کے خطوط' کا نیا ایڈیشن چھپنے والا تھا اور اس کے ڈسٹ کور کا ڈیزائن بن کر آیا تھا جس پر آرٹسٹ نے ایک ۔ جن کی تصویر بنائی تھی۔ چودھری

صاحب نے یہ ڈیزائن دکھایا تو میری رگِ ظرافت پھڑکی اور میں نے میرزا ادیب سے مخاطب ہوکر کہا: 'بھئی میرزا ڈیزائن تو خوب ہے لیکن آرٹسٹ نے تمھاری تصویر ٹھیک نہیں بنائی'۔ میرزا ادیب قدرتی طور پر برہم ہوئے لیکن چودھری برکت علی اور کرشن چندر کے رویّے میں نمایاں فرق تھا۔ جہاں چودھری برکت علی نے میرے فقرے کو لطیفہ سمجھ کر اس سے لطف لیا وہاں کرشن چندر نے اس لمحۂ غنیمت سے فائدہ اٹھا کر میرزا ادیب کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کی۔

حلقۂ نیاز مندانِ لاہور کے اراکین جو پنجاب کی ادبی زندگی میں اب کافی موثر تھے۔ کرشن چندر کی دوستی کا ہدفِ خصوصی تھے اور 'ادبی دنیا' کے مدیر صلاح الدین احمد کے دربار میں تو وہ روزانہ حاضری دیتے تھے۔ مولانا کی بھی ان پر خصوصی نوازش تھی۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ 'ادبی دنیا' میں ان کا کوئی افسانہ شائع ہوا ہو اور مولانا نے اس پر طویل تعریفی نوٹ کا اضافہ نہ کیا ہو۔ 'شاہکار' کے لیے افسانہ دیتے وقت مجھ سے بھی انھوں نے یہی کہا تھا کہ میں اس پر ایک تعریفی نوٹ لکھ دوں اور ان کا یہ مطالبہ میں نے بخوشی پورا کر دیا تھا۔ ان دِنوں کرشن چندر افسانے بھی اچھے لکھتے تھے۔ فارمولائی افسانے لکھنا انھوں نے بعد میں شروع کیا۔

سیاست میں پہلا قدم کرشن چندر نے کمیونسٹ پارٹی کے خلاف اٹھایا تھا۔ لاہور میں نوجوانوں کے ایک محدود سے حلقے میں ان دنوں ایم.این.رائے کے خیالات مقبول ہو رہے تھے۔ ان خیالات کے اوّلین مبلّغ عبداللہ صفدر تھے جو ماسکو کے تربیت یافتہ کمیونسٹ تھے۔ وہ تحریکِ ہجرت کے دوران میں روس گئے تھے اس لیے دوسرے مہاجرین کی طرح ان کے گرد بھی ایک رومانوی سا ہالہ پیدا ہو گیا تھا۔ اور ایم.این.رائے کا ماضی تو دیومالائی تھا۔ وہ کامنٹرن کے ممبر رہ چکے تھے۔ یورپ کی متعدد کمیونسٹ پارٹیوں میں انھیں راہنمایانہ مقام حاصل تھا اور چین کی انقلابی تحریک کی باگ ڈور بھی کچھ دن انہی کے ہاتھ میں رہی تھی۔ جن لوگوں نے ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کی تاریخ پڑھی ہے وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ یہاں کی تحریک بھی شروع شروع میں باہر سے وہی چلاتے رہے۔ ان کی یہ شہرت بھی تھی کہ بحث میں انھوں نے لینن تک سے لوہا لیا تھا اور جزواً اپنا نقطۂ نظر اس سے منوا لیا تھا لیکن اسٹالن کے دور میں وہ منحرف قرار پائے تھے اور کامنٹرن سے نکال دیے گئے تھے۔ عبداللہ صفدر کو ساتھی ملنے میں دیر نہیں لگی۔ کرشن چندر، نریندر ناتھ سیٹھ اور میں سب

اس گروہ میں شامل ہو گئے۔

ہم لوگ کمیونسٹوں کا اس بات پر مذاق اڑاتے تھے کہ وہ بات بات پر مارکس اور لینن کا حوالہ دیتے ہیں اور اپنے ذہن سے کام لینے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ اپنے مزید ساتھی پیدا کرنے کے لیے ہم نے پیپلز کلب کے نام سے ایک کلب قائم کیا جس کی واحد سرگرمی یہ تھی کہ وہاں دن رات سیاسی بحثیں ہوتی رہتی تھیں۔ لیکن دو ٹریڈ یونین بھی ہم نے بنا ڈالیں۔ کرشن چندر ان سب سرگرمیوں میں شریک تھے لیکن کھل کر بات کرنے سے وہ اکثر پہلو بچاتے تھے۔ کمیونسٹوں سے ان کا میل جول رفتہ رفتہ شروع ہوا۔ اب ماضی کے واقعات پر نظر ڈالنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ انھوں نے سوچی سمجھی اسکیم کے تحت کیا تھا اگر وہ شروع ہی میں کمیونسٹ پارٹی سے جا ملتے تو شاید ان کی اتنی پذیرائی نہ ہوتی۔ وہ محمود بغاوت کی راہ پر چل کر اپنی قدر و قیمت بڑھانا چاہتے تھے۔

ساحرلدھیانوی

لاہور کی بساطِ شعر و ادب کے نو واردوں میں ساحر لدھیانوی تھے۔ میری ان کی ملاقات روز نامہ 'نیشنل کانگریس' کی ملازمت کے دوران اتفاقاً ہی ہوگئی۔ لاہور سے مالیر کوٹلہ جاتے ہوئے میں کچھ دیر کے لیے لدھیانہ ٹھہر گیا تھا۔ اس مختصر سے قیام کے دوران میں میں عرش ملسیانی سے ملنے گیا۔ شام کو کوئی مشاعرہ تھا۔ ان کے ساتھ ہی وہاں بھی چلا گیا۔ ساحر سے میری ملاقات وہیں ہوئی۔ ساحر مجھے اپنے گھر لے گئے اور بڑی تواضع سے پیش آئے۔ ساحر کا گھر آزاد منش نوجوانوں کا اچھا خاصہ تکیہ تھا۔ ان میں کوئی آرٹسٹ تھا، کوئی ٹریڈ یونینسٹ اور کوئی شاعر یا صرف شاعری کا پرستار۔ ساحر کے گھر ان سب کی تواضع ہوتی تھی اور تقریباً ہر وقت جمگھٹا لگا رہتا تھا، مجھے یہ ماحول پسند آیا چنانچہ جب یہ اصرار ہوا کہ میں اس رات کی بجائے اگلے دن مالیر کوٹلہ جاؤں تو میں نے فوراً ہی مان لیا۔

ساحر گورنمنٹ کالج لدھیانہ میں طالب علم تھے، جہاں مخلوط تعلیم تھی۔ کالج کا پرنسپل ایک انگریز تھا جو ہندوستان میں نیا نیا آیا تھا اس لیے یہاں کے ماحول سے کچھ زیادہ واقف نہیں

تھا۔ چاہتا تھا کہ مخلوط تعلیم صحیح معنی میں مخلوط ہو۔ لڑکے اور لڑکیاں صرف ہم درس ہی نہ ہوں بلکہ آزادانہ آپس میں ملیں جلیں بھی۔ یہ فیصلہ کافی پیچیدگیوں کا باعث بنا۔ اکثر طالب علم قدامت زدہ گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا ماحول انھیں راس نہیں آ سکتا تھا۔ ایک لڑکا جو قرآن کا حافظ تھا لڑکیوں کو اپنی طرف راغب کرنے کے لیے اوراد و وظائف میں مصروف ہو گیا، ایک اور جو کچھ صوفی منش تھا، دریا کے کنارے ایک ٹانگ پر کھڑا ہو کر عملِ حب کی پریکٹس کرنے لگا۔ آخر کالج کے حکام نے فیصلہ کیا کہ حقیقی مخلوط تعلیم کا تجربہ کامیاب نہیں ہوا ہے اور طلبا کو اس حقیقت سے آگاہ کر دیا گیا۔ جو لوگ میل جول کے کچھ زیادہ قائل تھے انھیں بالواسطہ طور پر مشورہ دیا گیا کہ وہ اس کالج کو چھوڑ کر کسی اور کالج کا رخ کریں۔ اس سلسلے میں ساحر لدھیانوی، لدھیانہ کو خیر باد کہہ کر لاہور کے دیال سنگھ کالج میں پہنچ گئے۔

لدھیانہ کے کمیونسٹوں کو، جن کے لیے ساحر لدھیانوی کافی مفید تھے یہ تشویش ہوئی کہ لاہور میں گوپال متل کی بری صحبت میں پڑ کر ساحر کا ترقی پسندی پر سے ایمان اٹھ جائے گا۔ انھوں نے لاہوری کمیونسٹوں سے استدعا کی، جنھوں نے ساحر کے ایمان کو راسخ بنانے کے لیے انھیں لاہور اسٹوڈنٹس یونین کا صدر بنا دیا لیکن ساحر کی دلچسپیاں تعلیم اور سیاست دونوں سے بس واجبی ہی تھیں۔ نہ ان کی تعلیم کا سلسلہ زیادہ دن چلا اور نہ لیڈری کا اور میرے ساتھ ان کے مراسم بدستور قائم رہے۔

تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوا تو ساحر شعر و ادب کی طرف زیادہ متوجہ ہوئے۔ وہ مرنجان مرنج اور خوش اطوار تھے اور مادّی طور پر صرف یہی نہیں کہ ضرورت مند نہیں تھے بلکہ دوسروں پر تھوڑا بہت خرچ بھی کر سکتے تھے۔ اس لیے انھیں شعر و ادب کی محفلوں میں جلد ہی پذیرائی حاصل ہو گئی۔ ہر دلعزیزی حاصل کرنے کے لیے وہ ایثار بھی کافی کرتے تھے۔ خود پیسہ اخبار اسٹریٹ کے گھٹیا چائے خانوں میں چائے پیتے اور دوسروں کی مال روڈ کے ریستورانوں میں تواضع کرتے۔ 'ادبِ لطیف' کے ایڈیٹروں کو تنخواہ برائے نام ہی ملا کرتی تھی اور ایک طرح سے یہ عہدہ اعزازی ہی تھا لیکن حصولِ شہرت کا 'ادب لطیف' چونکہ ایک اچھا ذریعہ تھا اس لیے ایڈیٹر ڈھونڈنے میں مالکوں کو کوئی خاص مشکل پیش نہیں آتی تھی۔ ساحر لدھیانوی کچھ نمایاں ہوئے تو یہ عہدہ انھیں سونپ دیا

گیا۔ ساحرلدھیانوی کو جوتنخواہ ملتی تھی اس سے کہیں زیادہ وہ جریدے کے مالک چودھری نذیر احمد کی تواضع پر صرف کر دیا کرتے تھے۔ اس بنا پر انھیں ادارتی معاملات میں کافی چھوٹ ملی ہوئی تھی۔ وہ جریدے کو اپنے ذاتی پروپیگنڈے کے لیے استعمال کرتے اور دوسرے شاعروں اور ادیبوں کے ساتھ مراسم استوار کرنے کے لیے بھی۔

پروپیگنڈے کا فن بھی ساحر کو خوب آتا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ حصولِ شہرت کا بہترین ذریعہ یہ ہے کہ اپنے متعلق زیادہ سے زیادہ غلط فہمیاں پھیلائی جائیں۔ 'تلخیاں' کا پہلا ایڈیشن انھوں نے ڈھائی سو کی تعداد میں چھاپ کر دوستوں میں تقسیم کر دیا۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد دوسرا ایڈیشن چھاپنا چنداں مشکل نہیں تھا اور پہلے ایڈیشن کے اتنی جلدی ختم ہو جانے کو بڑی آسانی سے کتاب کی بے پناہ مقبولیت کا نام دیا جا سکتا تھا۔

مجاہد بننے کا ان دنوں سبھی ادیبوں اور شاعروں کو جنون تھا۔ ساحر بھی اس معاملے میں پیچھے نہیں تھے لیکن یہ نکتہ بھی ان کی نظر میں تھا کہ ع

عاشقی شیوۂ رندانِ بلاکش باشد

رندِ بلاکش وہ نہیں تھے۔ اس لیے بہت ہی پھونک پھونک کر قدم رکھتے تھے، ان کی نظم 'چکلے' جو کسی فلم میں آ کر کافی مشہور ہو گئی ہے، وہ انھوں نے اسی زمانے میں لکھی تھی۔ اس نظم کا ایک مصرعہ تھا ع

خدیجہ کی ہم جنس رادھا کی بیٹی

کسی نے ان سے کہا کہ طوائف کو خدیجہ کی ہم جنس کہنے کی بنا پر مسلمان ان سے خفا ہو جائیں گے اور انھیں پیٹیں گے، ساحر نے فوراً ہی یہ مصرعہ اس طرح بدل دیا ع

زلیخا کی ہم جنس رادھا کی بیٹی

جب کچھ دوستوں نے یہ کہا کہ طوائف کو رادھا کی بیٹی کہنے پر ہندو بھی برہم ہو سکتے ہیں تو ساحر نے کہا: 'ہندو پیٹیں گے نہیں'۔

کمیونسٹوں کی ذہنی افتاد اور ان کے طور طریقوں کے بارے میں ساحر کی دوستی کے طفیل مجھے کئی بار اہم اور دلچسپ باتیں معلوم ہوئیں۔ میکلوڈ روڈ کی وہ کوٹھی جس میں پابندی اٹھ جانے کے بعد پنجاب کمیونسٹ پارٹی کا دفتر قائم ہوا، پہلے کچھ طالب علموں نے مل کر لے رکھی تھی۔

ان میں ساحر بھی شامل تھے۔ میرا خیال ہے کہ ساحر کو چھوڑ کر، جو اپنے حصّے کے اخراجات خود ادا کرتے تھے، باقی طالب علم کمیونسٹوں کے خرچے پر ہی پل رہے تھے۔ بہر حال واقعہ یہ ہے کہ یہ کمیونسٹوں کا اچھا خاصا اڈّہ تھا۔ ساحر کی وجہ سے میرا وہاں کافی آنا جانا تھا اور کئی بار تو رات بھی وہیں بسر ہو جاتی۔ ساحر کو اپنے دوستوں کے طور طریقے پسند نہیں تھے اور ان کی حرکتیں وہ مزے لے لے کر مجھے سنایا کرتے۔ ایک بار انھوں نے مجھ سے ایک کتاب کا ذکر کیا جو ایک کامریڈ کے پاس تھی اور جس میں یہ بتایا گیا تھا کہ کمیونسٹ بننے کی دعوت کس کس قسم کے لوگوں کو کس کس طرح دینا چاہیے۔ مجھے اس کتاب کو دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہوا اور میں ساحر کا ممنون رہوں گا کہ یہ انھوں نے مجھے حاصل کر دی۔ میں نے کمیونسٹوں کے حق میں اور ان کے خلاف بہت کچھ پڑھا ہے، لیکن اس سے زیادہ انکشاف انگیز کتاب میری نظر سے کبھی نہیں گزری۔ کتاب میں نظریاتی مباحث مطلق نہیں تھے۔ صرف یہ بتایا گیا تھا کہ مختلف قسم کے لوگوں کی کمزوریوں اور ان کے احساسِ شکست خوردگی سے کس کس طرح فائدہ اٹھایا جائے۔ یہ طریقِ کار وہی تھا جو جرائم پیشہ ٹولیاں بھرپائی کرنے کے لیے اختیار کرتی ہیں۔

ساحر روگ پالنے والے آدمی نہیں اور کمیونسٹ پارٹی سے ان کی وابستگی بھی تفریحی سطح پر ہی تھی۔ نظریاتی بحث میں میرے ساتھ وہ کبھی نہیں اُلجھے۔ اگر میرے سامنے کسی کمیونسٹ کو زچ ہوتے دیکھتے تو ایک خبیثانہ سی مسرّت بھی محسوس کرتے۔ بعد میں یہ ضرور کہتے: 'متّل صاحب! آپ ٹھیک کہتے ہیں لیکن کوئی تمھارے اور تمھاری پارٹی کے ساتھ کیوں آئے؟ تمھارے پاس ہے ہی کیا؟ کمیونسٹ جس ادیب کا ہاتھ پکڑتے ہیں اسے شہرت کی چوٹی پر پہنچا دیتے ہیں'۔ یہ ان کی نوازش تھی کہ مجھ سے ان کی دوستی بہر حال قائم رہی۔ انھوں نے میرے خلاف دشنام طرازی میں شرکت نہیں کی اور نجی طور پر اپنے کامریڈوں کے پاس میری تعریف ہی کرتے رہے۔ یہ وہ ضرور چاہتے تھے کہ میں راہِ راست پر آ جاؤں۔ کہا کرتے تھے: 'کمیونسٹ کہتے ہیں ایک بار اپنے دوست سے ہاں کہلوا دو پھر دیکھو ہم اسے کس بلندی پر لے جاتے ہیں'۔ لیکن نہ میں نے ہاں کہی اور نہ کمیونسٹوں نے مجھے بلندی پر پہنچانے کا جتن کیا۔

مخمور سعیدی

'تحریک' کے اکتوبر 1953 کے شمارے میں مخمور سعیدی کا تعارف کراتے ہوئے میں نے لکھا تھا:

''اختر شیرانی اور بسمل سعیدی کا ہم وطن یہ نوجوان شاعری کے میدان میں اگرچہ نووارد ہے لیکن اس شان سے وارد ہوا ہے کہ بیساختہ یہ شعر یاد آ جاتا ہے؎

بالائے سرش ز ہوشمندی
می تافت ستارۂ بلندی

بے امتیازی کے اس دور میں جب ادبی میدان میں بھی شہرت کا مدار سازباز پر ہے، حصولِ علم اور تکمیلِ فن کے لیے اس نوجوان کی کوشش اور محنت قابلِ داد ہے اور پھر اس کا ضبط بھی قابلِ ستائش ہے کہ جب تک شاعری میں اس نے قابلِ قدر استعداد پیدا نہ کرلی۔ اس کے دل میں 'چھپنے' کی آرزو پیدا نہیں ہوئی۔ نوجوان شاعروں میں بہت کم شاعر بے عیب شعر کہتے ہیں اور ان چند شاعروں میں مخمور سعیدی کا نام شامل ہے۔''

اس تحریر کو سات برس ہو گئے۔ مخمور اب میدانِ شاعری کا نووارد نہیں بلکہ اس کا شمار مشہور شاعروں میں ہوتا ہے۔ وہ 'تحریک' کا صرف ایک قلمی معاون ہی نہیں بلکہ اس کا مدیرِ بااختیار ہے۔ اس کا کلام ہند اور پاکستان کے موقر ادبی جریدوں میں شائع ہوتا ہے اور اسے قبولِ خواص کے ساتھ ساتھ قبولِ عوام کی سند بھی حاصل ہے۔ اس مدّت میں اس کے فن میں مسلسل ارتقا ہوا ہے اور اس میں پہلے سے زیادہ گہرائی اور گیرائی آ گئی ہے۔

اس کی اس ترقّی اور شہرت پر اس سے کہیں زیادہ ناز مجھے ہے کہ میں نے اردو دنیا کو اس کے متعلق جن توقعات میں شریک کیا تھا اس نے انھیں پورا کیا ہے۔

مخمور کے کلام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اس کے مخصوص زاویۂ نگاہ اور اس کے اپنے وارداتِ قلبی کا آئینہ دار ہے۔ اس نے شعری مفروضوں کو قلم بند کر دینے پر قناعت نہیں کی بلکہ

جو احساسات اور خیالات اس کے دل و دماغ میں ابھرتے رہے ہیں انھی کی عکّاسی کو اس نے اپنا فرض سمجھا ہے۔ لہٰذا اس کے کلام میں ندرتِ فکر بھی ہے اور ندرتِ احساس بھی۔ اس کی جمالیاتی اور عشقیہ شاعری میں آپ افتادگی تو پائیں گے لیکن یہ افتادگی ایک غیور انسان کی افتادگی ہے۔ مخمور کے کلام میں آپ اس پندارِ بیجا کا مظاہرہ بھی نہیں پائیں گے جو اپنے منطقی مفہوم میں احساسِ بے مائیگی کی تلافی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ اس کے نزدیک خودداری کے معنی یہ نہیں کہ انسان کا کوئی مرکزِ عقیدت ہی نہ ہو۔ اس کا سر جھکتا ضرور ہے لیکن چوکھٹ دیکھ کر۔

مخمور کی سیاسی نظمیں اس کی موروثی حرّیت پسندی کا مظہر ہیں۔ اس کے بزرگوں نے ہندوستان کی آزادی کے لیے اپنا خون بہایا تھا لہٰذا اگر وہ آزادی کا خیر مقدم کرتا ہے یا اس کی ناتمامیوں کی نشاندہی کرتا ہے، یا اہلِ ملک کو ان خطروں سے خبردار کرتا ہے جو ملک یا فرد کی آزادی کو پیش آ سکتے ہیں تو اس کا اسے پورا حق پہنچتا ہے۔ یہ شاعرانہ تعلّی نہیں بلکہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اس کے نسب نامے پر خون کی مہریں ثبت ہیں۔

کتابیات

1	لاہور کا جو ذکر کیا	مرتب: پریم گوپال متّل	موڈرن پبلشنگ ہاؤس	1981
2	ادب میں ترقی پسندی: ایک ادبی تحریک یا سازش؟	گوپال متّل	نیشنل اکادمی، نئی دہلی	1958
3	گوپال متّل: شخصیت اور فن	کمار پاشی	موڈرن پبلشنگ ہاؤس	1983
4	کلیاتِ اختر شیرانی	گوپال متّل	موڈرن پبلشنگ ہاؤس	1997
5	کینسر وارڈ	الیگزینڈر رمولنیٹن	نیشنل اکادمی، نئی دہلی	1974
6	گوپال متّل: شخص اور شاعر	ڈاکٹر ضیاء الدین	ادارہ فکر جدید، نئی دہلی	2005
7	فن اور شخصیت آپ بیتی نمبر	صابر دت	ساکار پبلی کیشنز، بمبئی	1980
8	اردو کے چند نامور ادیب اور شاعر	ڈاکٹر حامد اللہ ندوی	موڈرن پبلشنگ ہاؤس	1995
9	گوپال متّل: ایک مطالعہ	محمد عبدالحکیم	نازش بک سینٹر، دہلی	1977
10	تحریک دہلی	مختلف شمارے	مکتبہ تحریک دہلی	–

11	نگینہ بیکری کا قلندر	کشمیری لال ذاکر	موڈرن پبلشنگ ہاؤس	1999
12	چند مضامین	پروفیسر صادق	موڈرن پبلشنگ ہاؤس	2002
13	بزم چراغاں	پروفیسر سلیمان اطہر جاوید	مکتبہ جدید، نئی دہلی	1999
14	اردو غزل میں پیکر تراشی	ڈاکٹر شہپر رسول	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی	2012
15	گوپال متّل: شخصیت اور فن	رضیہ بیگم	موڈرن پبلشنگ ہاؤس	2012
16	گوپال متّل: ذات اور صفات	پریم گوپال متّل	موڈرن پبلشنگ ہاؤس	2012
17	اردو تنقید کا ارتقا	عبادت بریلوی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس	2002
18	تنقیدی نگارشات	پروفیسر مظفر حنفی	موڈرن پبلشنگ ہاؤس	2014
19	تفہیم شعر	ڈاکٹر اسلم جمشید پوری	موڈرن پبلشنگ ہاؤس	2014
20	ماہنامہ پرواز	ڈاکٹر ساحر شیوی	لندن	2014
21	اشاریہ ماہنامہ تحریک	مطیع اللہ خان	موڈرن پبلشنگ ہاؤس	2010
22	اردو نثر ایک مطالعہ	قاضی مشتاق احمد	موڈرن پبلشنگ ہاؤس	2005
23	اردو ادب کی تاریخ	نسیم قریشی (مرحوم)	مسکین بک ڈپو، جے پور	1999
			جدید اضافہ شدہ ایڈیشن	(صفحہ 38-237)

تقسیم کے بعد ہندوستان میں اردو زبان وادب کے فروغ میں جو دشواریاں پیش آئیں اس کی ایک بڑی وجہ اردو کے ڈھیروں ادیبوں وشاعروں کی نقل مکانی تھی۔ ملک کے سیاسی حالات اردو کے حق میں اس لیے بھی خراب ہوئے کہ پڑوسی ملک نے اسے اپنی قومی زبان کا درجہ دے دیا۔ ایسے دورِ ابتلا میں اردو زبان وادب کے وقار کو از سرِ نو بحال کرانے میں جن لوگوں نے اہم رول ادا کیا ان میں گوپال مِتّل کا نام بھی شامل ہے یوں تو گوپال مِتّل ایک مستند شاعر ہیں اور ان کے چار شعری مجموعے 'دوراہا' (1944)، 'صحرا میں اذان' (1970)، 'شرارِ نغمہ' (1984) اور 'سچے بول' (1988) شائع ہو کر مقبول عام ہو چکے ہیں جبکہ ان کے مضامین کا انتخاب 'ادب میں ترقی پسندی' اور 'ایک آپ بیتی' لاہور کا جو ذکر کیا، بھی ہند وپاک میں کئی بار نہایت مستند خود نوشت میں اپنا نام درج کرا چکا ہے لیکن ان کا سب سے بڑا کارنامہ 'ماہنامہ تحریک' ہے جو تواتر کے ساتھ 1954 تا 1980 شائع ہوتا رہا اور 1980 کے بعد جو ادبی نسل پروان چڑھی اس کی ذہنی آبیاری کی اور اس سے متاثر ادیبوں کے خلاف مضامین شائع کیے اور جدیدیت کی تحریک کے لیے زمین بھی ہموار کی۔

پریم گوپال متل جو گوپال متل کے صاحبزادے ہیں، نے قومی کونسل کے مونوگراف اشاعتی پروگرام کے لیے نہایت عرق ریزی سے دریا کو کوزے میں بند کرنے کے مصداق یہ مونوگراف لکھ کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ مضبوط جڑوں کی شاخیں بھی سرسبز وشاداب ہوا کرتی ہیں۔ یقیناً گوپال متل پر تحریر کیا گیا یہ مونوگراف طلبا واساتذہ دونوں کے لیے سودمند ہوگا۔

ISBN: 978-93-87510-79-1

NCPUL
New Delhi

₹ 80/-

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
فروغ اردو بھون، ایف سی، 33/9،
انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولا، نئی دہلی - 110025